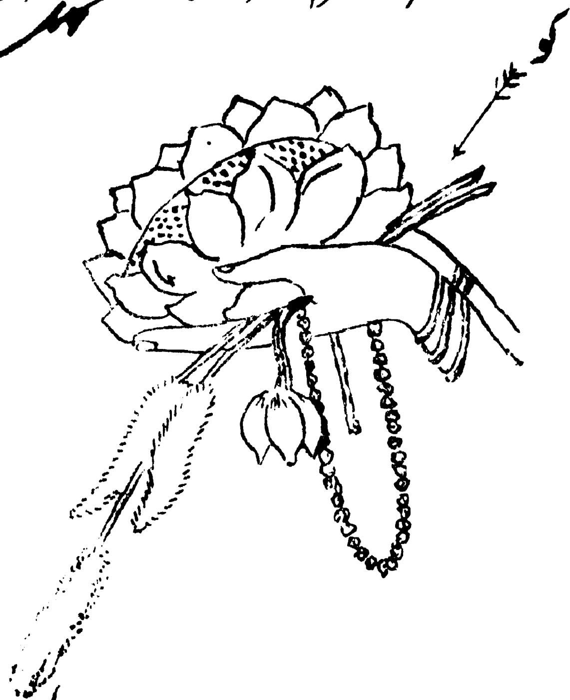
اُلفت و عقیدت کی بنا پر

رفیقِ محترم شری پت امر امرتسری

کو



شانتی نرائن شاد

امرت سر

۲ مئی ۱۹۴۰ء

فہرست

بہت اچھا افسانہ ہے

دیباچہ

دور حاضرہ کے ہندوستانی ادیبوں میں شری ٹیگور کا رتبہ سب سے اونچا ہے۔
ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم کے شعرا نے آپ کے آگے سر تسلیم خم کیا ہے۔ آپکی تصانیف کی دھوم
دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہے۔ لیکن افسوس کہ جہاں دوسرے زبان دان
آپکی ادبی خدمات سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ وہاں اردو دان اصحاب اس سے بے بہرہ ہیں۔ اس
بردست کمی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے آپکی چند شہرہ آفاق تصانیف کو مندرجہ ذیل ناموں
سے اردو جامہ پہنایا۔ جیون پربھات، طوفان، ترکش، دنیا ایک کہانی ہے، ٹیگور کے افسانے
علاوہ ازیں گورا اور بغاوت زیر طبع ہیں۔ امید کامل ہے شاعر اعظم ٹیگور کے دیگر شاہکار بھی
جلد از جلد آپ کے دست مبارک تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گا۔
چند سال ہوئے جب میں نے ڈاکٹر ٹیگور کی کہانیوں کا ایک مجموعہ پڑھا تھا۔ ہر کہانی میں ایک
تھا۔ سوز تھا۔ سبق تھا۔ میں نے اُن میں سے چند کہانیاں منتخب کیں۔ اور اس چناؤ میں
ں بات کا خاص خیال رکھا گیا۔ کہ ہر کہانی سے کچھ سبق حاصل ہو سکے۔ اس کے بعد کتاب

کا نام تجویز کرنے میں کافی چھان بین کرنی پڑی۔ نتیجہ کے طور پر "سرد شعلے" پیش خدمت ہیں۔ جو ایشیا کے اس عظیم ترین شاعر کے خاص افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قدرتی مناظر کی دل فریبی اور دلکشی، فراق اور طوفان انگیز کالی راتیں۔ حسن اور عشق، محبت کے کرشمے، بے وفائی اور جفاکاری، سوسائٹی کے ظلم، مایوسیاں، ستم و بے داد، غم و یاس، فریب فطرت جلے دلوں کی آہ یہ سب کچھ آپ کو ان افسانوں میں دیکھنے پڑے گا۔ ہر افسانہ اور اس کا ہر ایک لفظ اپنے اندر خاص کشش لئے ہوئے ہے۔ دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ آپ پر ایک خاص قسم کی محویت طاری ہو جائے گی۔ جس کا اثر آپ کے دل کی گہرائیوں میں مدت تک بنا رہیگا۔ ہندوستان کو فخر ہے۔ کہ اس نے دنیا کو ایک درخشندہ ستارہ عطا کیا ہے۔ جس کی تجلی سے آج ادبی دنیا کے زمین و آسمان روشن ہیں۔ مصنف نے لفظ لفظ میں ایک سوز بھر دیا ہے ایک آگ ہے۔ اٹھتا ہوا شعلہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا میں اپنا فرضِ اولین تصور کرتا ہوں۔ کہ حضرت ٹیگور کے بلند ترین پاکیزہ خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکنا ناچیز کی قابلیت سے دور ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ میں خاص دقت پیش آئی ہے مگر باوجود ہر بات کے میں نے مصنف کے خیالات کو مکمل طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ یہ ناظرین خود ہی اندازہ لگالیں گے۔ امید جو کچھ اچھائیاں اور قابل داد باتیں ہیں۔ ان سب کا سہرا قابل مصنف کے سر ہے۔ اور اس میں جو نقائص ہیں۔ ان کی تمام تر ذمہ داری کے لئے مترجم شرمندہ احسان ہے۔

"رحمت پہ اُن کی میرے گناہوں کو ناز ہے"

(نشاد کنجاہی)

سرد شعلے

بلبل نے آہ کھینچی ہے کس سوزِ دل کے ساتھ
اک آگ سی لگی ہوئی صحنِ چمن میں ہے

ٹیگور

شعلۂ اُلفت

افسانہ نمبر ۱

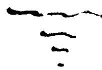
اُسکے دربار میں

اے میری زندگی کے مالک! کیا ہر روز میں تیرے مقابل کھڑا رہ سکوں گا؟ --- بحر و بر کے مالک! کیا میں ہاتھ جوڑ کر تیرے سامنے کھڑا رہوں؟

کیا تیرے وسیع آسمان کے نیچے - غیر آباد تنہائی و سکون میں نرم دل سے میں تیرے سامنے کھڑا رہوں؟

کیا تیرے مصروف عالم میں جہاں چاہ کی کوشش اور ہنگامہ بپا ہے - دوڑ دھوپ میں لگے ہُوئے انسانوں کے درمیان تیرے سامنے کھڑا رہ سکوں گا؟

اے شاہوں کے شاہ! جب اس دُنیا میں میرا کام ختم ہو جائیگا، تو کیا میں تنہائی اور خاموشی سے تیرے سامنے کھڑا رہ سکوں گا؟



شعلۂ اُلفت

میری پڑوس ایک بیوہ ہے ——— بیوہ ۔ وہ بیوہ جس نے دُنیا کا کچھ بھی نہ دیکھا ہو ۔ اس کے والدین نے بچپن میں ہی اس کی شادی کر دی ۔ یہی اُس کا گُناہِ عظیم تھا ۔۔ وہ اُس ایک کلی کی طرح تھی ۔ جو بغیر کھلے ہی شاخ سے الگ کر دی گئی ہو !

پھول تو کچھ دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اِن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مَیں دل ہی دل میں اس کی پرستش کرتا ہُوں ۔ اس کے متعلق جو خیالات میرے دل میں ہیں ۔ اُسے سوائے "پرستش" کے پاک لفظ کے اور کسی ایسے لغو لفظ سے لکھنا نہیں چاہتا ..

میرے اس راز کے متعلق میرے دوست کشور بھی کچھ نہ جانتے تھے ۔

اس لئے اس طرح جو میں نے اس معاملہ کو اپنے دل کی گہرائی میں چھپائے رکھا۔ اس کا مجھے ایک قسم کا غرور سا تھا!

لیکن دل کی حالت اس دریا کی طرح ہے۔ جو اپنے منبع میں رُکنا نہیں چاہتا۔ اور کسی طرح بہہ ہی نکلتا ہے۔ اور اگر کبھی تعمیل خواہش میں ناکام رہتا ہے۔ تو وہاں مثلِ سیماب تڑپتا ہوا۔ ایک میٹھا درد پیدا کر دیتا ہے۔

تمام بالا باتوں کو سوچتے ہوئے۔ خیال پیدا ہوا کہ اپنے دِلی خیالات کو عملی طور پر شعروں کی شکل میں تبدیل کر دُوں۔ لیکن۔ واہ قسمت۔ کیا کہوں۔ بے بس ہوں۔ "ظالم قلم اس بہاؤ کی طرف چلنے کو رضامند نہیں۔ شائد وہ یہ راستہ مشکل اور خوفناک سمجھتا ہے۔

اُسی دوران میں ایک حیران کُن اور پُراسرار بات ہوئی۔ میرے دوست کشور نے آندھی کی روانی اور زلزلہ کی تیزی سے شعر کہنا شروع کر دیئے۔ اس سے پیشتر وہ کبھی بھی شعر و شاعری کی طرف راغب نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس کا رجُوع کبھی اس طرف ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ نہ اُسے شعر کہنے کا ڈھنگ اور نہ نظم لکھنے کا سلیقہ۔ پھر بھی اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ شاعری۔ بوڑھاپے میں بیاہی ہوئی۔ عورت کی طرح اس کے سر پر سوار ہوگئی۔ آخر وُہ شعروں کی دُرستگی پر میری مدد کے لئے میرے

بھی ہو گیا؟

ایک شاعر کی طرح ـــــ "میرا دماغ کسی کے تصور میں نہ معلوم کہاں سے کہاں چکر لگا رہا تھا" سچائی ہی ایشور ہے۔ تصور ہی زندگی ہے۔ سچی کہانی۔ خیالات کی لہروں کو ایک پتھر کی طرح دبا رکھتی ہے لیکن خیالات اس کا راستہ کھول دیتے ہیں۔

کشور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے بھی تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دُرست ہے۔ پھر چند لمحہ خاموش رہ کر بولا۔ "دُرست۔ بالکل دُرست"!

مَیں یہ پیشتر ہی تسلیم کر چکا ہوں۔ کہ میری محبت میں کچھ شُبہ سا تھا۔ اِسی لئے تو مَیں اب تک اپنی طرف سے کچھ نہ لکھ سکا تھا۔ لیکن جب کشور کو پس پردہ بٹھا لیا۔ تب میری قلم نے بھی اپنا مُنہ کھول دیا۔ مَیں کشور کی آڑ لے کر لکھنے لگا۔ میری نظمیں عُموماً عشق کی گہرائیوں سے بھری ہوتیں۔ ان میں میرا دلی راز پنہاں ہوتا۔ مایوسی ہوتی۔ اور ان سب کے علاوہ میری نابینا اُلفت کا راز ہوتا۔

کشور نے ایک دن کہا۔ "یہ تمہاری نظمیں ہیں۔ انہیں مَیں تمہارے ہی نام سے شائع کراؤں گا!

"خُوب! لکھی ہُوئی تو تمہاری ہیں۔ مَیں نے تو تھوڑا ردّ و بدل کیا ہے۔ ان پر تمہارا ہی مکمل حق ہے"

آہستہ آہستہ کشور کو بھی اس کا یقین ہو گیا!

مَیں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ جس طرح ایک نجومی ستیاروں کا ذکر کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ مَیں بھی اُسی اپنے ہمسایہ گھر کی رنگ دار کھڑکیوں کو دیکھا کرتا ہُوں۔ اور کبھی کبھی تو پجاری کی پرستش سے دیوی کے نیاز بھی حاصل ہو ہی جاتے ہیں۔ اُس بدنصیب کے چہرہ سے یاس و غم کے آثار ہویدا تھے آنکھوں سے حیا ٹپکتی تھی۔ اُس کے دیکھنے سے میرے دل کا کچھ بوجھ ہلکا سا ہو ہو جاتا تھا۔

اُس دن مارچ مہینہ کے تیسرے پہر۔ آسمان پر بادل گھنے چھا رہے تھے۔ آندھی آنے کو تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک اُٹھتی تھی۔ میری پڑوسن کھڑکی کے پاس محض اکیلی کھڑی تھی۔ مَیں نے اس دن آسمان کی طرف ٹکٹکی بندھی ہوئی اشکبار آنکھیں دیکھیں۔ ان میں خیالات کا طوفان اور جذبات کا ہجوم پوشیدہ تھا۔ اور التجا بھری نگاہیں۔ آسمان پر تھرکتی ہوئی بجلی کی لہروں پر رقصاں ہیں!

مجھے یقین ہو گیا کہ آج میرے پڑوسی کے دل میں کس قدر ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وہ کسی نہ ہونے والے کی یاد میں اپنا دِل تڑپا رہی ہے۔ دیوتا کے لئے انسان نہیں ہے۔ مگر انسان کے لئے دیوتا ضرور ہے۔

اس کی دو نوں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بے بسی۔ اس دن کی آندھی سے گھبرائے ہوئے پرندکی طرح اڑی جارہی تھی۔ مگر کہاں!

"میرے دل کے گھونسلے کی طرف"!

اُس دن کے بعد مَیں اپنے دل پر قابُو نہ رکھ سکا۔ اُس وقت کسی دُوسرے کی نظم کی دُرستگی میں راحت نہ ملی کسی نہ کسی طرح کسے دُوسرے کام کو کرنے کو دل بے چین سا ہونے لگا۔!

تب مَیں نے اپنے شہر میں "بیواؤں کی شادیاں" کرانے کی قسم کھالی! بڑے لیکچروں اور تحریروں سے نہیں۔ بلکہ اس نیک اور کارِ ثواب کے لئے مَیں نے زرصرف کرنے کا بھی ارادہ کرلیا ۔۔۔ مصمم اور اٹل!

کشور مجھ سے بحث کرنے لگا۔ کہ دِل کے اندر جذبۂ عشق نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے۔ تو دل کو سکون سا ملتا ہے۔ مگر شادی کا خیال آجانے سے ہی وہ دلی سکُون غایب ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی باتیں سُن کر مُجھے غصّہ آجاتا ہے۔ جو لوگ تقدیر کے تھپیڑوں سے پٹے جا چکے ہیں اور نانِ شبینہ تک کے محتاج ہیں۔ اُن کے سامنے اگر کوئی شخص کھانے کی چیزوں کے بدلے انہیں پھولوں کی خوشبو اور پرندوں کے گانوں سے اُن کا پیٹ بھر دینا چاہے۔ تو

کہاں تک کامیابی ہو گی۔

مَیں نے غصّہ سے کہا۔ ”دیکھو کشور! مصوّر لوگ کہا کرتے ہیں کہ جلتے ہوئے مکان کا نظّارہ بڑا ہی قابل دید ہوتا ہے مگر گھر کے صرف نظارہ ہی کو اکیلے نہیں دیکھا جاتا۔ اس میں رہائش رکھنی پڑتی ہے۔ مصوّر جو کہیں سو کہیں۔ مگر گھر کی مُرمّت کرنا ضروری ہے۔ تو تم بیوگی پر صرف نظمیں ہی لکھنا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ اس میں ایک مُرجھایا ہُوا دل اپنی بے بس خواہشات کو لئے ہوئے چُھپا بیٹھا ہے۔

مَیں نے سمجھا تھا کہ کشور میرے خیالات کے خلاف ہو گا اور اسی لئے مَیں نے اُس دن اُس سے بڑے جوش سے گفتگو کی تھی۔ لیکن مَیں غلطی پر تھا۔ کشور میرا ہمخیال نکلا۔ اُس نے صرف ایک ہی گہری سانس لے کر میری سب باتوں کے آگے سر جُھکا دیا۔ اور میرے دل میں ان کے لئے جو خیالات تھے۔ ان کو ظاہر کرنے کا موقع دیئے بغیر ہی چلا گیا۔

دس دن گُذر گئے۔ ایک دن کشور نے آکر کہا۔ کہ ”اگر تم میری امداد کرو۔ تو مَیں خود ایک بیوہ سے شادی کرنے کو تیار رہوں“۔

یہ سُن کر مَیں خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا۔ کشور کو محبت سے گلے لگا کر کہا۔ ”جو خرچ ہو گا۔ مَیں خود اپنی جیب سے دُوں گا۔ اس کے بعد کشور نے سب قصّہ سُنا دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ کشور کسی خیالی بیوہ پر ہی نہیں

بلکہ ایک زندہ حسین۔ پُرسحر اور باحیا عورت پر فِدا ہے۔ اور یہ بات اب تک پردۂ راز میں پوشیدہ تھی۔ کشور نے ابھی کسی پر ظاہر نہیں کی تھی۔ جن ماہواری اخباروں میں کشور کی ـــــ میری نظمیں شائع ہوئی تھیں۔ وہ جہاں ہم چاہتے۔ پہنچ جاتیں۔ وہ نظمیں ضائع نہ گئیں۔ بغیر ملاقات کے یہ دو دل ملنے کا طریقہ کشور نے خُوب نکالا تھا۔

کشور کا کہنا ہے کہ اُس نے کسی قسم کی بد اخلاقی یا چالاکی نہیں کی۔ بلکہ اُسے یقین تھا کہ وہ بیوہ بالکل غیر تعلیم یافتہ تھی۔ اس کے بھائی کے نام مُفت ہی کئی ماہواری اخبار بھیجنے شرُوع کر دیئے۔ اسی سے اس کے دل کو تسلی ملنے لگی۔ انہیں بھیجنے کے وقت کشور یہ سوچتا ہوگا۔ کہ مَیں کسی دیوتا کو پھُول چڑھا رہا ہُوں۔ اس کا پھل ملے یا نہ ملے۔

کشور نے اُس کے بھائی کے ساتھ بھی دوستی کر لی۔ اور اس نے کہا تھا۔ کہ اس دوستی میں اس کا خاص مطلب نہ تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جس کو محبت کی جاتی ہے۔ اس کی ہر چیز سے اُنس ہو جاتا ہے۔

اسے آپ کشور کی خوش قسمتی کہیں کہ اس حسینہ کا بھائی بیمار پڑ گیا۔ بیماری کچھ معمولی نہ تھی۔ موذی دِق نے آ دبایا تھا۔ مہینوں بستر پر پڑا رہا۔ چونکہ کشور اس کی بیمار پُرسی کو جاتا تھا۔ اس لئے اس کی بہن سے بھی گفتگو ہونی شرُوع ہو گئی۔ کشور چُونکہ صاف دِل تھا۔ اس لئے وہ اس سے

شاعری کے متعلق بحث کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ راز افشا ہو گیا۔ جو اخبار اس کے ہاں آتے ہیں۔ وہ کشور ہی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔

ایک دن بحث مباحثہ میں کشور اس سے شادی کا تذکرہ کر بیٹھا وہ پہلے تو کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ مگر جب کشور نے گراموفون کی طرح مجھ سے سُنی ہوئی ساری تدبیر استعمال کر ڈالیں اور دو چار آنسو بھی بہائے۔ تو آخر اس کو ماننا ہی پڑا۔ اب بیوہ کے سسرال والے کچھ روپیہ چاہتے تھے۔ جس سے کہ اس کی شادی کا خرچ چل سکے۔

مَیں نے کہا ـــــ روپیوں کی کیا فکر ہے۔ ابھی لے جاؤ۔ پھر کشور کچھ دیر بعد سنجیدگی سے بولا۔ "اس کے علاوہ میرے پتا جی مجھے جو خرچ ہر ماہ دیتے ہیں۔ وُہ بھی شادی کے پانچ چھ ماہ بعد تک بند ہی رہے گا۔ اس لئے اس عرصہ تک ہم دونوں کے اخراجات بھی تمہیں کو برداشت کرنے پڑیں گے۔ مَیں نے بغیر کچھ خیال کئے ایک چیک کاٹ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اور کہا۔

تمہیں جتنے روپیوں کی ضرورت ہو۔ تم بغیر کسی خیال کے بنک سے نکال سکتے ہو۔ مگر بھئی تم اس بیوی کا نام تو بتلا دو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مَیں اس کا نام کبھی نظم میں نہ لاؤں گا۔ اور اگر کبھی لکھ بھی دیا۔ تو وہ اس کے بھائی کے پاس نہ بھیجکر تمہارے پاس بھیجوں گا۔

کشور نے کہا "مَیں اس سے نہیں ڈرتا ـــــ بھائی وہ بیوہ شادی

سے بہت ہی شرمندہ ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ مَیں تم کو اس کا نام نہ بتاؤں۔ مگر اب چھپانا فضول ہی ہے۔ وُہ تمہاری ہی پڑوسن ہے اور ۱۲ نمبر کے مکان میں رہتی ہے۔

اگر میرا دل لوہے کا بائیلر ہوتا تو اسی دھکے سے جھٹ پھٹ جاتا۔ کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر مَیں نے کہا۔ کیا "بیوہ شادی" وہ پسند کرتی ہے؟ کشور نے ہنس کر کہا "ہاں بھائی۔ اس وقت تو رضامند ہی ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "صرف نظمیں پڑھ کر ہی وہ تم کو دِل دے بیٹھی"؟

کشور نے جواب دیا — "کیوں میری وہ نظمیں کیا کچھ کم اثر رکھتی تھیں"؟

مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔ تم خوش نصیب ہو۔ اور اپنے شعلۂ الفت کو دبانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

شعلۂ آتش

افسانہ نمبر ۲

آدرش بھارت

جہاں قلب خوف سے آشنا نہیں اور سر اونچا رہتا ہے۔

جہاں علم آزاد ہے۔ جہاں دُنیا خانگی دیواروں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ نہیں ہوگئی۔

جہاں الفاظ سچائی اور صداقت کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔ جہاں مستقل کوشش اپنے لمبے بازو تکمیل کی طرف بڑھاتی ہے۔ جہاں عقل وادب کا شفاف آبشار رسم و رواج کی خشک ریتلی زمین میں بہ باد نہیں ہوا۔

جہاں تخیّل علم وادب کی طرف راغب کرتا ہے۔

اے مالک! میرے بھارت ورش دلیش کو بیدار کر۔



*

شعلۂ آتش

چوری اور وُہ بھی شاہی خزانہ میں۔

چشم زدن میں یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی - ہر ایک زبان پر اس کا ذکر ـــــ جدھر جاؤ۔ یہی باتیں۔

"اگر چور گرفتار نہ ہو۔ تو محافظ خزانہ کی خیر نہیں"۔

"چور بھی بڑا ہی چالاک ہوگا"۔

"اور ساتھ ہی دلیر بھی"۔

"شاہی خزانہ میں چوری اس بات کا ظاہرا ثبوت ہے"۔

"چور ضرور گرفتار ہونا چاہئے"۔

یہ تھیں باتیں جو بجلی کی سی تیز رفتاری سے ایک زبان سے دوسری زبان پر اور دوسری زبان سے تیسرے کان میں پہنچ رہی تھیں۔

کلدیپ ـــــــ نوجوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ سڈول جسم تھا۔ مگر اس شہر میں اجنبی تھا کسی غیر ملک سے یہاں گھوڑوں کے بیوپار کے لئے وارد ہوا تھا۔ مگر راستہ میں ڈاکوؤں نے تمام مال و اسباب لُوٹ لیا۔ وہ بے چارہ پردیسی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ اور اب ایک خستہ مندر میں جو شہر کے باہر چند قدم کے فاصلہ پر واقع تھا۔ پڑا تھا۔ اس مندر کو تعمیر ہوئے شاید ایک ہزار سال ہوگیا ہو۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ بادشاہ کے سپاہی چور کی تلاش میں یہاں بھی آپہنچے۔ اور آخر کلدیپ کو چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہتھکڑی پہنا کر جیل کی طرف روانہ ہوئے۔

پدمنی ایک حسن فروش حسینہ! بازارِ حسن میں بیٹھی ہوئی راہ گیروں کے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اور عالمِ شباب میں مدہوش اس کی ہر ادا پر سینکڑوں دِل مجروح ہوتے تھے۔ اس کے ایک ایک لفظ پر ہزاروں زبانیں بند ہوتی تھیں۔

آج بھی وہ اپنے بالاخانے کی کھڑکی میں جلوہ گر تھی۔ اُس کی

نگاہیں راستہ پر تھیں۔ جیسے کوئی شیرنی شکار کی تلاش میں ہو۔ مگر یکایک وہ لرز اُٹھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حیرت سے آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اس نے اسی وقت باندی کو بُلایا اور دریافت کیا "وہ کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم ——— بھگوان ہی بہتر جانتے ہیں"۔

"جاؤ ——— اور میری زبان سے ان سپاہیوں کو کہو کہ اس قیدی کو میرے پاس لاؤ۔ جاؤ دیر کی حاجت نہیں"۔

ملازمہ چلی گئی۔ چند منٹ بعد سپاہی قیدی کو لے کر حاضر ہوا۔ اور بولا۔

"حُسن کی ملکہ! تُم غلطی پر ہو۔ اور یہ اس وقت درخواست بھی نامناسب ہے۔ کیونکہ میں نے قیدی کو بہت جلد شاہی حضور میں حاضر کرنا ہے۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا۔ تو خود میری شامت آئے گی۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت تمہاری طرف خیال نہیں کر سکتا"۔

کلدیپ نے سر اُٹھایا۔ اور پدمنی کی طرف دیکھا۔ اور پھر نگاہ نیچی کر کے کہنے لگا۔

"میں نہیں سمجھتا۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ کہ آپ کسی شخص کو ——— راہ چلتے مُسافر کو بُلا کر اُس کا مذاق اُڑائیں۔ اپنے رُعبِ حُسن میں شاید آپ سب کچھ روا سمجھتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ انسانیت سے بعید ہے"۔

"مذاق! ـــــ اور آپ سے! آپ غلطی پر ہیں۔ میں بخوشی ان طلائی چوڑیوں کی جگہ آپ کی یہ آہنی زنجیر پہننے کو تیار ہوں"۔

مگر ان تمام باتوں کا جواب قیدی نے کچھ نہ دیا۔ آخر پدمنی نے سپاہی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اے شاہی قانون کے علمبردار! نیک سیرت انسان! میں اپنی خوشی۔ آرام۔ چین۔ راحت۔ حسرت۔ دولت۔ عزت۔ یہاں تک کہ زندگی تک تیرے قدموں پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔ اور اس کے عوضانہ میں صرف ایک بات تم سے منوانا چاہتی ہوں۔ کیا مانو گے؟"

"پہلے اقرار نہیں کر سکتا ـــــ شاید"

"صرف اس بے گناہ شخص کی رہائی چاہتی ہوں۔ اور اس کے بعد میرا سب کچھ تیرا ہوگا"

"نہیں! مہربان خاتون۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر یہ ہو گیا۔ تو مجھے بادشاہ کے غصہ کی آگ میں بھسم ہونا ہوگا۔ اس غصہ کو سرد کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ قیدی حاضر حضور کیا جائے"

"تو کیا دو تین دن کی مہلت بھی نہیں مل سکتی؟ یہ اشرفیاں تمہاری نذر ہیں"

سپاہی نے پہلے تو کچھ سوچا۔ پھر زیر لب مسکرایا اور کہا۔

"خیر یونہی سہی"

قیدی کو تاریک کوٹھڑی میں دو دن اور دو راتیں گزر گئیں دوسری شب کو اُس نے بھگوان سے پرارتھنا کی اور ایک پھٹی ہُوئی چٹائی پر بیٹھ کر وقتِ آخر کی انتظار کرنے لگا۔ یکایک دروازہ کُھل گیا۔ ایک عورت ہاتھ میں روشنی لئے۔ چہرہ گھونگٹ میں چھپائے ہوئے داخل ہوئی۔ اس نے سپاہی کو کچھ اشارہ کیا۔ اور اس نے آگے بڑھ کر قیدی کی زنجیریں کھول دیں۔ قیدی چشمِ حیرت سے کبھی سپاہی کبھی قانون اور کبھی اپنی طرف دیکھتا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"اے نیک طبع عورت! مَیں تیرے احسان کو عُمر بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ تیرا شبِ تاریک میں روشنی لے کر داخل ہونا۔ میری صُبحِ زندگی کی نشانی ہے"۔

پدمنی نے ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور ہنسی اور خُوب ہنسی۔ یہاں تک کہ اس کی چشمِ آہُو سے آنسُو رواں ہوئے۔ اور اس نے آہُوں آنکھوں اور لرزتی ہُوئی زبان سے کہا۔

"مَیں اور رحم دل۔ مجھ سے بے رحم شائد کوئی جلّاد بھی نہ ہوگا"۔

یہ کہا اور قیدی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔ پدمنی اور کلدیپ کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔

صبح کے وقت جانبِ مشرق سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ آفتاب اپنی سُنہری کرنیں سطحِ آب پر پھیلا رہا تھا۔ پانی جگمگا رہا تھا —— لبِ ساحل ایک کشتی کھڑی تھی۔ پدمنی نے قریب ساحل پہنچتے ہوئے کہا۔

"نوجوان اجنبی آؤ۔ کشتی میں بیٹھو۔ یہ تمہیں اچھی طرح یاد رہے کہ مَیں نے ہی تمہیں اس کال کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ اور اب بذریعہ کشتی تمہارے ساتھ عازمِ سفر ہوں۔

کشتی بڑی تیزی سے دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ سورج دیوتا ہر لحظہ اُونچا ہو رہا تھا۔ پرندے اپنے پُر سحر راگ سے آسمان میں ترنم پیدا کر رہے تھے۔ کلدیپ نے پدمنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اے پُراسرار حسینہ! اے میرے دل کی ملکہ! تمہارے کتنے روپیہ نے مجھے آزادی دلائی ہے۔ ——؟"

"ابھی نہیں —— وقت خود بتا دے گا۔"

صبح سے آہستہ آہستہ دوپہر ہونے لگی۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں اشنان کر کے سروں پر پانی کے برتن رکھے۔ گھروں کو واپس جا رہی تھیں۔ آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ پگڈنڈی پر آفتاب کی منوّر کرنیں محوِ رقص تھیں۔ ہوا کے ایک گرم جھونکے نے پدمنی کے چہرے سے گھونگٹ ہٹا دیا۔ —

کلدیپ نے آہستگی سے کہا۔

"پدمنی! تم نے مجھے رہائی تو دلائی ہے۔ مگر کس طرح؟ ۔۔۔ اب تمہاری اِس مستقل قید سے رہائی کس طرح دستیاب ہو سکتی ہے"؟

حسینہ نے اپنے گھونگٹ کو دُرست کیا اور جواب دیا۔

"ابھی وقت نہیں"!

شام ہوئی۔ سُورج غرُوب ہو گیا۔ ہر جانب تاریکی مسلط تھی آسمان پر ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ماہِ کامل نے اپنی نورانی سرد کرنوں سے سطحِ آب کو روشن کر دیا۔ ستارے ندی میں ڈُبکیاں لگانے لگے۔ ہر جانب خاموشی تھی۔ بالکل خاموشی۔ پدمنی، کلدیپ کے بازو کا سہارا لئے محوِ خیال تھی۔ اس کی سیاہ عنبریں زُلفیں شب کی اس سیاہی کو دو بالا کرنے میں مصرُوف تھی۔ دُور جنگل سے ہوتے ہوئے ہوا کے مشکبار جھونکے محوِ خرام تھے۔ آخر حسینہ رُکتے ہُوئے گلے سے بولی۔

"میرے دِل کے مالک! جو کچھ مَیں نے کیا۔ وُہ واقعی ناممکنات میں شامل تھا۔ مگر اس کا نوکِ زبان پر آنا ناممکن نہیں ۔۔۔ مگر پھر بھی مختصر طور پر سُناتی ہوں۔ وہ بدبخت شاما چرن تھا۔ جس نے خود پر الزامِ جرُم لیا اور صرف میری خاطر اور محض میری خاطر اپنی عزیز اور قیمتی جان کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ پروا تک نہ کی۔

اُف تک زبان پر نہ لایا ـــــــ پر یتم میرے اِس گُناہ کی ۔میرے اِس ناقابلِ مُعاف جُرم کی وجہ صرف تمہاری اُلفت ۔تمہاری کشش تھی۔ ـــــــ بس"

اس دوران میں خورشید خطۂ عالم کی پُر اسرار دِل چسپی اور سحر کار حُسن سے لُطف اندوز ہو کر بادلوں کی آڑ میں چھُپ چکا تھا۔ جنگل کی خاموشی اور شب کی سیاہی میں ہر قدم پر اضافہ ہو رہا تھا۔

آہستہ۔آہستہ۔کلدیپ کا بازو نوجوان حسینہ کی کمر سے الگ ہوگیا۔مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔وہ ایک خاموش پتھر کے بُت کی طرح ایک طرف بیٹھا تھا۔چشم زدن میں پدمنی اس کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"میرے بھگوان مجھے مُعاف کر دو۔اور میرے اس جُرم کی سزا کا فیصلہ عالم کے بھگوان پر چھوڑ دو"

"میری یہ ناپائیدار زندگی ایک خوفناک گُناہ کے بدلے میں لی گئی ہے۔لعنت ہے مجھ پر اور میری اس زندگی پر"

"وُہ یکا یک کشتی سے کُود پڑا۔اور تیر کر کنارے کی طرف آیا۔ مگر ساحل پر ٹھہرا نہیں۔اور جنگل کی طرف چل پڑا۔اتنا چلا کہ آخر راستہ بند ہوگیا۔اور مقابل درختوں اور خونخوار نوکیلے پودوں نے کھڑے

ہو کر اُسے ختم کر دیا۔ وُہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ وہیں زمین پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ ہراساں تھا۔ خاموشی۔ تاریکی اور خوف نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

"راستہ میں کون میرا تعاقب کر رہا تھا؟"

یہ خیال تھا۔ جو رہ رہ کر اُس کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اس کی پریشانی میں اضافہ کرتا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا اور کرخت لہجہ میں بولا:۔

"کیا تُم میرا پیچھا نہ چھوڑ دگی؟"

حسینہ اس کے سامنے دوزانو ہو گئی۔ اب اس کے بکھرے ہُوئے بال اُس کے ریشمی دامن میں پوشیدہ تھے۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے دیکھتے ہُوئے لرزتی ہوئی زبان سے کہا:۔

"اب مَیں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ محض تمہاری خاطر مُرتکب گنُاہ ہُوئی۔ اور اب تمہیں کیسے چھوڑ دُوں؟ ہاں اگر تم میری جان لینا چاہتے ہو۔ تو اپنے پوِتر ہاتھوں سے مار ڈالو۔ اس طرح ستا ستا کر مارنا۔ کیا تمہیں واجب ہے ـــــ؟"

جنگل کی خوفناک خاموشی ایک سانس کے عرصہ تک لرزی۔ درختوں کے زمین میں پوشیدہ تنوں میں ایک خوف طاری ہو گیا۔

ہوا میں ایک دہشتناک خون منجمد کر دینے والی چیخ گونجی اور ساتھ ہی ایک گرم لاش بکھرے ہوئے خشک پتّوں پر آگری۔

صبح ہوئی۔ کلدیپ جنگل کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ وہ میدان میں داخل ہوا۔ اس وقت سورج دُور ———— بہت دُور بہت ایک دیو مندر کے کلس پر اپنی زرنگار کرنوں کی دولت بکھیر رہا تھا۔

کلدیپ پریشانی کی حالت میں تمام دن دھوپ میں اِدھر اُدھر پھرتا پھراتا رہا ——— شام ہوئی ——— بے خیال۔ بے ارادہ۔ کشتی کے پاس پہنچا۔ لبِ ساحل ایک پازیب پڑی تھی۔ اس نے اسے اُٹھا لیا۔ ایک بار اچھی طرح دیکھا۔ پھر چھاتی سے لگا لیا۔ دِل سے ایک ہُوک اُٹھی۔ دِل زخمی ہو گیا۔ اوندھے منہ پاس پڑے ہوئے ایک سیاہ لبادے پر گر پڑا۔ اس وقت پدمنی کا حسین چہرہ اس کے پیشِ نظر تھا۔

سورج غروب ہوا۔ شام ہوئی۔ اور شب کی خاموش فضا آہستہ آہستہ پرندوں کی آواز میں بدل کر تاریک ہو گئی۔ چاند دُور درختوں کے جُھنڈ کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کلدیپ اُٹھا۔ آبگوں آنکھوں سے جنگل کی طرف دیکھا۔ بازو

پھیلا دیئے۔ اور دیوانوں کی طرح چلاتا یا ——— "آپیاری ———
میرے پاس آ"

پربھات کی نامکمل روشنی میں ایک متحرک سایہ لب ساحل کھڑا تھا۔
آخر اُس نے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پیارے! مَیں آگئی ہُوں۔ آپ کے حسین ہاتھ مجھے مار ڈالنے میں
کامیاب نہیں ہوئے۔ بس میری سزا اب یہی کافی ہے۔ کہ مَیں
زندہ ہوں"

یہ کہتے کہتے پدمنی کلدیپ کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ نوجوان کے
چہرے پر ایک بار خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہاتھ پھیلائے اس کی طرف
بڑھا۔ مگر فوراً ہی جس طرح کوئی سانپ دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ اِس
طرح کچھ یاد آنے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیئے اور بولا۔

"اُف تم کیوں آگئیں؟ ——— جاؤ ——— جاؤ!"

پھر اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ مُنہ دُوسری طرف پھیر
لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جاؤ! چلی جاؤ! اور مجھے اپنے حال پر رہنے دو"

وہ چند سیکنڈ بے حس و حرکت کھڑی رہی اور اب پھر آخری بار اس
کے پاؤں پر جھک گئی۔ اور پرنام کے ساتھ ہی اپنے پیارے کے پاؤں

آنسوؤں سے دھو دیئے ۔ پھر بغیر پیچھے دیکھے ۔ وہ ایک آہ کی طرح جنگل میں جا کر غائب ہو گئی ۔

کلدیپ ایک جلتا ہوا دل ۔۔۔۔۔۔ شعلۂ آتش پہلو میں لئے ہوئے کشتی میں بیٹھ گیا ۔

شعلۂ کدورت

افسانہ نمبر ۳

نغمے!

اِس دفعہ اپنی کشتی کو میں سمندر میں دھکیل دوں گا۔ ساحل پر کھڑے کھڑے میرا وقت فضول ضائع ہو رہا ہے۔ حیرت ہے مجھ پر۔

موسم بہار ختم ہو چکا ہے۔ اور خزاں رخصت ہو رہی ہے۔ مگر میں ابھی تک مرجھائے ہوئے پھولوں کے بار سے دبا کھڑا ہوں۔

لہریں ساحل سے ٹکرا کر پر شور ہو گئی ہیں۔ اور کنارے پر سایہ دار راستے میں زرد پتیاں اڑ کر گر رہی ہیں۔

کس ویرانے کی طرف تم دیکھ رہے ہو۔ کیا تم ہوا میں پھیلتے ہوئے نغموں کو محسوس نہیں کرتے؟ جو مدھر راگنیوں سے مل کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ رہے ہو۔

شعلۂ کدورت

زمیندار کے نائب کیدار ناتھ کے گھر سیتا ایک براہمنی کھانا بنانے کے لئے نوکر ہوئی۔ کم عمر تھی۔ خوبصورت تھی۔ نیک اور آیئنہ چلن تھی۔ دونوں وقت پُوجا پاٹھ کرتی۔ کہیں دُور کی رہنے والی وہ براہمنی بوجہ غربت مصیبت کے چنگل میں پھنس کر کیدار ناتھ کے ہاں کھانا بنانے کے لئے آرہی۔ ایک دن مالک کی بُری نظر سے اپنے کو بچانے کے لئے اسے بہو کے سامنے دو زانو ہوکر رونا پڑا۔ بہو نے نہایت نرم اور شفقت آمیز الفاظ میں کہا:-

"سیتا! تم یہاں سے اپنی عزت بچا کر چلی جاؤ۔ کہیں اور نوکری

کر لو۔ یہاں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔"

لیکن مینا کے لئے وہاں سے بھاگ جانا آسان نہیں تھا۔ پاس کوئی خاص رقم بھی نہ تھی۔ ہونگے یہی چار یا پانچ آنے کے پیسے۔ بیچاری جاتی بھی تو کہاں۔ آخر اسی گاؤں میں دوارکا داس بھٹ کے ہاں جا کر نوکری کر لی۔ اور اُن کو اپنا تمام سابقہ قصہ بھی سُنا دیا۔ دوارکا داس بڑے شریف۔ رحم دل اور غریب پرور انسان تھے۔ انہوں نے اسے نہایت مہربانی سے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اُن کے لڑکوں نے کہا۔

"آپ ناحق مصیبت کو اپنے گھر بلا رہے ہیں۔"

"اگر کوئی مصیبت زدہ خود آکر میرے سہارے کا سوالی ہو۔ تو میں اُسے دھکا دیکر نکال دینا نہیں چاہتا۔"

اُن کے الفاظ میں استقلال اور رحم کی جھلک جھلک رہی تھی کیونکہ دوارکا داس کی فطرت نیک تھی۔ اس لئے اس نے ایسا جواب دیا۔

چند دن بعد ـــــ دوپہر کے وقت دوارکا داس اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ کہ کیدار ناتھ داخل ہوا اور بولا:۔

"آپ نے ہماری براہمنی کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا ہے؟ گھر میں کھانا بنانے والے کے بغیر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

اس کے جواب میں بھٹ جی نے دو چار سچی باتیں کہہ سُنائیں۔ وہ

نیک دل تھے اور سچے آدمی تھے۔ کسی کی عزّت رکھنے کے لئے بات گھما پھیر کر کہنے کی انہیں عادت نہ تھی

نائب صاحب یہ باتیں سُن کر دِل میں کہنے لگے۔ چیونٹی کے بھی پَر نکل آئے ہیں۔ اب اس کی خیر نہیں۔ پھر وُہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور بڑے زور سے نمسکار کیا۔

ایک ہفتہ کے بعد بھٹ جی کے ہاں پولیس آئی۔ اُن کی عورت کے تکیہ کے نیچے سے کیدار ناتھ کی بیوی کے چند زیورات نکلے۔ براہمنی چور ثابت ہوئی۔ اور جیل بھیجدی گئی۔ بھٹ جی چُونکہ مشہور اور باعزّت آدمی تھے۔ اِس لئے چوری کے مال کو رکھنے کے جُرم سے بال بال بچ گئے۔ مگر ان کو یقین ہو گیا کہ میرے گھر نوکری کرنے سے ہی براہمنی کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اُن کے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ لڑکوں نے کہا۔

"گاؤں چھوڑ کر اب کہیں اور چلئے۔ اب یہاں رہنا مناسب نہیں"

"میں جدّی مکان چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتا۔ جو تقدیر میں ہوتا ہے۔ وُہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ خواہ کہیں بھی چلے چلیں۔ مصیبت کہاں نہیں آسکتی"

کچھ دِنوں بعد نائب نے زمین کا لگان بڑھانے کی کوشش کی

جس سے کسانوں نے بہت شور و غل کیا۔ بھٹ جی کے پاس جتنی زمین تھی۔ وہ انہیں بطور خیرات ملی تھی۔ اس سے زمیندار کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نائب نے اپنے مالک سے کہا۔

"بھٹ جی۔ کسانوں کو اُکسا رہے ہیں"۔

زمیندار نے جواب دیا "جس طرح ہو۔ بھٹ جی کو نیچا دکھانا چاہئے"۔

نائب پھر بھٹ جی کے پاس آیا اور نمسکار کرکے بولا:۔

"شرمان جی کی یہ زمین ہماری سرحد میں پڑتی ہے۔ اس لئے اُسے آپ کو چھوڑنا پڑے ہوگا"۔

"آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ وہ زمین تو بہت دِنوں سے میرے پاس ہے"۔

بھٹ جی کے گھر سے ملی ہوئی زمین کے لئے زمیندار کی طرف سے نالش ہوئی۔ بھٹ نے سوچا۔ زمین چاہے چلی جائے۔ مگر میں بڑھاپے میں عدالت کا منہ نہ دیکھوں گا۔ لڑکوں نے کہا۔

"اگر آپ زمین چھوڑ دینگے۔ تو اس گھر میں کیسے رہیں گے؟"

لڑکوں کے اصرار اور باپ دادا کے گھر کی محبت سے مجبور ہو کر بھٹ جی عدالت میں گئے۔ منصف صاحب نے صرف انہی کی گواہی پر مقدمہ خارج کر دیا۔ بھٹ جی کی زمین کے کاشتکاروں نے اِس جیت پر بڑی

خوشیاں منائیں ۔مگر بھٹ جی اس کے خلاف تھے ۔ زمیندار کے دماغ
میں شعلہ کدورت بھڑک اُٹھا۔ نائب صاحب نے مقدمہ
ہائی کورٹ میں چلا دیا ۔سب وکیل لوگ بھٹ جی سے کہتے تھے۔ کہ اس
مقدمہ میں جیت آپ کی ہی ہوگی ۔کیا دن کبھی رات ہو سکتا ہے ؟
ایک دن نائب کے ہاں بڑی دُھوم دھام سے محفل ہوئی ۔شہر
سے طوائفیں بھی بلائی گئیں ۔بھٹ جی کو اُن کے وکیل سے پتہ چلا ۔
کہ وہ مقدمہ ہار گئے ہیں اسی لئے نائب کے ہاں جشن منایا جا رہا ہے۔
بھٹ جی نے ماتھا پیٹ کر ـــــ وکیل سے پُوچھا :۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ ـــــ میری کیا حالت ہوگی ؟"
دن کس طرح رات ہوگیا؟ اس کا مطلب وکیل صاحب نے یُوں
سمجھایا ۔کہ حال میں جو جج ہو کر آئے ہیں ۔اُن کی پہلے منصف صاحب
سے کھٹ پٹ تھی ۔اُس وقت تو ان کا اختیار نہ تھا ۔مگر اب چونکہ مقدمہ
ان کے اجلاس میں تھا ۔اس لئے آپ کے خلاف کر دیا ہے۔ بھٹ جی
نے کہا ۔"تو کیا بڑی عدالت میں بھی اس کی کچھ سُنائی نہ ہوگی ؟"
وکیل صاحب نے کہا۔" جج صاحب نے ایسا فیصلہ لکھا ہے کہ
وہاں جانے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا "۔
آنکھوں میں آنسو بھر کر بھٹ جی بولے ـــــ "تو میرے گھر بار کا

کیا ہوگا؟" ان کی آواز لرز رہی تھی۔

وکیل نے بہت ہی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ معاملہ بگڑ گیا ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں رہی۔"

دُوسرے دن نایب بڑی شان وشوکت سے بہت سے آدمیوں کو ساتھ لے کر بھٹ جی کے ہاں گیا۔ بھٹ جی کو پرنام کر کے کہا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ وہی ہوتا ہے۔ جو منظورِ خُدا ہوتا ہے۔"

بھٹ جی اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے۔ اور سٹرنیک گرجان دیدی نائب مُسکراتا ہوا چلا گیا۔

بھگوان! کیا شعلۂ کدُورت اتنا خوفناک اور خطرناک ہوتا ہے؟

شعلۂ نفس

افسانہ نمبر

نقلی راجکمار

تم جس بچے کو راجکمار کے لباس میں ملبوس کر رہے ہو۔ جس کے گلے میں ہار پہنا رہے ہو۔ اس سے اُس کے کھیل کی تمام مسرتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اُسے اُس کا لباس ہر قدم پر اس کو الجھا دیتا ہے۔ اور چلنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

اِس خوف سے کہ کہیں رگڑ نہ لگ جائے۔ یا خاک سے داغدار نہ ہو جائے۔ وہ اپنے کو سب سے دور علیحدہ رکھتا ہے۔ اور حرکت کرنے سے خوف کھاتا ہے۔

اے ماں! یہ سب فضول ہے کیوں کسی کو زمین کی پرصحت خاک سے علیحدہ ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر وہ ایک ظاہرہ تماشہ گاہ حیاتِ انسانی کے میں داخل ہونے کے حق کو کسی سے چھین لیتی ہے۔

شعلۂ نفس

دیو پور کے زمیندار گوپی ناتھ۔ اپنے بڑے لڑکے کو سب زمینداری اور گھر بار سنبھال کر تیرتھ یاترا کرنے چل نکلے۔ نرم دل اور رحمدل عزیز تھے۔ اس لئے سب لوگ انہیں سٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ تمام ان کی جدائی کو محسوس کر رہے تھے۔

ان کے لڑکے چمن لال پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ تعلیم شائد بی۔ اے تک پائی تھی۔ لمبا قد۔ سڈول جسم۔ سر کے بال انگریزی فیشن کے کٹے ہوئے اور آنکھوں پر چشمہ تھا۔ وہ زیادہ گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی اتنے پرہیزگار تھے کہ تمباکو تک نہ پیتے تھے۔

یہ سب خوبیاں ہوتے ہوئے بھی وُہ تیز مزاج تھے۔ اُن کے کاشتکاروں کو جلدی ہی معلوم ہوگیا کہ وہ کس مزاج کے مالک ہیں۔ بُوڑھے مالک لین دین میں نرم تھے۔ مگر یہ نئے مالک ایک پیسہ بھی نہ چھوڑتے تھے۔

کام کی چھان بین سے چمن لال کو معلوم ہوگیا۔ کہ بہت دِنوں سے براہمنوں کے پاس بغیر لگان کے زمین پڑی ہے۔ اور بہت سے کاشتکاروں کو کم لگان پر زمین دی ہوئی ہے۔

گوپی ناتھ سے اگر کوئی سوال کرتا۔ تو وُہ اسے بغیر پُورا کئے نہ رہتے تھے۔ یہ اُن میں ایک کمزوری تھی۔

چمن لال نے سوچا۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ کہ آدھی زمین بغیر لگان کے ہی دیدی جائے۔ انہوں نے دو باتیں سوچیں۔ ایک یہ کہ جو نکمے گھر میں بیٹھے بیٹھے بغیر کسی محنت کے ہی مُنافع کھا رہے ہیں۔ وُہ کسی رحم یا خیرات کے مستحق نہیں۔ اس قسم کی خیرات انسان کو کاہل اور سُست بناتی ہے۔

دُوسرے یہ کہ اُن کے باپ دادا کے وقت سے اب اخراجات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ خانگی اخراجات چلانا بھی بہت مُشکل ہوگئے ہیں۔ اس وقت اپنی عزّت قائم رکھنے کے لئے پہلے سے چوگنا خرچ

ہوتا ہے۔ غرضیکہ جس طرح میرے والد بغیر سوچے سمجھے ہی دولت لٹا گئے ہیں۔ ویسا کرنے سے اب گذر نہ ہوگا۔ بلکہ اُس لٹی ہوئی دولت کو سمیٹنا ہی دانشمندی ہے۔

جو اُن کے دل نے کہا۔ انہوں نے وہی کرنا شروع کر دیا۔ وُہ اپنے سوچے ہُوئے طریقہ پر عمل کرنے لگے۔

گھر سے جو کچھ باہر چلا گیا تھا۔ وُہ آہستہ آہستہ واپس آنے لگا۔ انہوں نے والد کی خیرات کا تھوڑا سا حصّہ ضرور بحال رکھا۔ اور جو بھی رکھا۔ وہ اس طریقہ پر کہ وُہ بہت مدّت تک خیرات نہ سمجھی جائے۔

گوپی ناتھ کو ہر دوار میں ہی اپنے کاشتکاروں کی تکالیف معلوم ہوگئیں۔ یہاں تک کہ کئی کاشتکار تو وہاں پہنچ کر سب حال سُنا آئے گوپی ناتھ نے چمن لال کو چٹھی لکھی۔ کہ "یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

چمن لال نے جواب دیا کہ "پہلے جس طرح کیا جاتا تھا۔ اُس طرح آمدنی کی بھی بہت صُورتیں تھیں۔ اس وقت زمیندار کاشتکاروں کو دیتا تھا۔ اور وہ زمیندار کو دیتے تھے۔ اس وقت نئے قانون کے زیر اثر زمیندار کی بہت سی آمدنیں بند ہوگئی ہیں۔ صرف لگان ملتا ہے اور صرف لگان وصُول کرنے کے اور کوئی بھی زمینداری کا رُعب نہیں رہا۔ اس لئے مَیں اگر اپنی رہی سہی آمدنی پر بھی نگاہ نہ رکھوں تو آپ ہی

بتلایئے کہ کھاؤں کہاں سے؟ اس وقت نہ مَیں کاشتکاروں کو زیادہ دے سکتا ہُوں۔ اور نہ اُن سے زیادہ ملنے کی توقع ہے۔ دان کرنے سے جلدی ہی بھکاری ہو جاؤں گا۔ عزّت اور خاندان کو بچانا نا ممکن ہو گا۔

گوپی ناتھ زمانہ کی اس تبدیلی کو دیکھ کر بہت فکر مند ہوئے انہوں نے سوچا کہ آج کل کے لڑکے آج کل کے ہی طریقہ پر کام کرتے ہیں۔ میرے وقت کے اصُول اب کام نہیں دے سکتے۔ اگر مَیں دُور بیٹھا ان کے اصُولوں پر نکتہ چینی کروں گا۔ تو وُہ کہیں گے کہ تُم اپنی جائداد سنبھالو۔ ہم سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے کیا؟ مَیں تو اپنی زندگی کے آخری دن ایشور بھجن میں گذاروں گا۔

(۲)

اسی طرح کام چلنے لگا۔ کئی مقدمے چلا کر چمن لال نے سب کام اپنی حسب خواہش کر لئے۔

بہت سے کاشتکاروں نے ڈر کر چمن لال کی سب جائز و نا جائز شرائط قبول کر لیں۔ صرف کریمن کا لڑکا رحیم کسی طرح بھی قابُو نہ آیا۔

چمن لال کا غصّہ بھی تیز ہو گیا۔ براہمن کو دان دینے کا تو کچھ مطلب بھی ہُوا۔ مگر ایک مسُلمان کو دان دینے سے کیا فائدہ؟

ایک معمولی مُسلمان بیوہ کا لڑکا۔ گاؤں کے خیراتی سکول میں تھوڑا سا لکھنا، پڑھنا سیکھ کر اتنا غرور کرنے لگا ـــــ کہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

چمن لال کو پُرانے نوکروں سے معلوم ہُوا۔ کہ رحیم کی ماں کریمن پر بھی بابو گوپی ناتھ بہت مہربان تھے۔ مگر اس مہربانی کا کوئی خاص سبب وہ نہ بتلا سکے۔ شائد بیوہ اور یتیم بچے کو دیکھ کر ہی گوپی ناتھ کو ان پر رحم آگیا تھا؟

لیکن چمن لال کو گوپی ناتھ کی یہ مہربانی بہت ہی ناجائز معلوم ہوئی۔ چمن لال نے اُن کی بُری حالت نہ دیکھی تھی۔ اس وقت کی آسودہ حالت کو دیکھ کر۔ چمن لال یہی سمجھتے تھے کہ ان کے مرحوم والد گوپی ناتھ کو کریمن نے کسی طرح دھوکہ دے کر زمین کا کچھ حصّہ ٹھگ لیا ہے۔

رحیم بھی عجیب خصلت کا نوجوان تھا۔ اس نے کہا۔ کہ جان چلی جائے مگر بابو گوپی ناتھ کی دی ہوئی زمین میں سے ایک گز زمین بھی نہ دُوں گا۔ دونوں طرف سے مقدمہ بازی شرُوع ہوگئی۔

کریمن نے اپنے بیٹے رحیم کو بہت سمجھایا۔ کہ بیٹا زمیندار سے مقابلہ نہ کرو۔ اب تک جن کے رحم پر زندگی گذار رہی ہے۔ ان کے ہی رحم پر رہ کر اپنی بقایا زندگی گذارو۔ تم زمیندار کی شرطیں مان لو۔

مگر رحیم نے جواب دیا: "اماں تم ان معاملوں کو نہیں جانتی۔"
مقدمہ بازی میں رحیم کو شکست ہونے لگی۔ لیکن جتنی ہی وُہ شکست کھا رہا تھا۔ اتنا ہی وہ ضدی بن رہا تھا۔ اُس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمین پر سب کچھ لگا دیا۔

ایک دن دوسرے پہر کے وقت کریمن رحیم سے پوشیدہ طور پر کچھ ترکاریاں لے کر چمن لال کو ملنے گئی۔ اس نے جاتے ہی چمن لال کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی اور بولی:۔

"خُدا تمہارا بھلا کرے بیٹا۔ رحیم کو خراب نہ کرو۔ مَیں اسے تمہیں دیتی ہوں ـــــ اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی حالت کا خیال کر کے اس کے کھانے پینے کا ذریعہ" زمین اسے دیدو" تمہارے پاس خُدا کا دیا بہت کچھ ہے۔ جتنی تمہاری زمین اس کے پاس ہے۔ اس سے تمہارا کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔"

اپنی پست حالت کو دیکھ کر کریمن، چمن لال سے پھر رشتہ جوڑنے آئی ہے۔ یہ دیکھ کر چمن لال تلملا اُٹھا۔ اُس نے کہا۔
"تم عورت ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ اگر کچھ کہنا ہو۔ تو اپنے لڑکے کو بھیجو"۔
کریمن نے اپنے اور غیر کے لڑکے سے یہی سُنا کہ تم عورت ہو۔ اس

مُعاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ کا نام لے کر آنسو پُونچھتے پونچھتے وہ گھر لوٹ گئیں۔

(۳)

مقدمہ دیوانی سے فوجداری۔ فوجداری سے ڈسٹرکٹ کورٹ اور وہاں سے ہائی کورٹ پہنچا۔ اسی میں دو سال گُذر گئے۔ رحیم جب سر سے پاؤں تک قرض میں ڈُوب گیا۔ تب کہیں جا کر اس کی جیت ہوئی۔ لیکن آسماں سے گرا۔ تو کھجُور پہ جا اٹکا۔ سرمایہ دار نے موقع پا کر اپنی رقم وصُول کرنے کے لئے مقدمہ کر دیا۔ آخر کار رحیم کا سب کچھ نیلام ہونے کا دن مقرر ہو گیا۔

اُس دن جمعہ کا دن تھا۔ بازار بھی اسی روز لگا کرتا تھا۔ آج بھی ندی کے کنارے بازار لگا۔ برسات سے ندی بھری ہوئی تھی۔ بہت سی چیزیں بکری ہو رہی تھیں۔ اگست کا مہینہ تھا۔ آم خُوب بِک رہے تھے۔ بادل گِھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی برسے گا۔ رحیم بھی بازار سے سامان لینے آیا۔ لیکن پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ آج کل اسے کوئی اُدھار بھی نہ دیتا تھا۔ وہ ایک بڑا چھُرا اور ایک لوٹا لیکر بازار میں آیا تھا۔ وہ انہیں دو چیزوں کو فروخت کر کے سامان خریدنا چاہتا تھا۔

شام کے وقت چمن لال بھی سیر کے لئے بازار آنکلے۔ دو سپاہی لاٹھی لئے ساتھ تھے۔ بازار میں چمن لال ایک آدمی سے بات چیت کرنے لگے۔ کہ اتنے میں رحیم چھرا تان کر چمن لال پر جھپٹا۔ مگر لوگوں نے پکڑ کر پولیس کے حوالہ کر دیا۔ بازار میں پھر ویسے ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ اس واقعہ سے چمن لال کچھ خوش نہ ہوا۔ ہم جس کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر ہم پر حملہ کرنے آئے تو اس کی ایسی بد ذاتی اور اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے۔ جو ہو۔ جیسا بدمعاش وہ تھا۔ ویسی ہی سزا اُسے ملے گی۔

اس واقعہ کو سُن کر چمن لال کے گھر کی عورتوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے سب نے کہا۔ رحیم بڑا پاجی ہے۔ اسے کافی سزا ملنی چاہئے۔ اِسی خیال سے سب کو تسکین حاصل تھا۔



اسی طرح چار دن گذر گئے۔ کل ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں رحیم کا مقدمہ سنا جائے گا۔ چمن لال کو حلفیہ بیان دینے جانا ہو گا۔ اب تک چمن لال گواہی کے کٹہرے میں نہ گئے تھے۔ لیکن اس معاملہ میں گواہی دینے میں انہیں کوئی عار نہ تھی۔ دُوسرے دن عین وقت پر جیسا کہ چمن لال گھوڑی پر سوار ہو کر کچہری پہنچے۔ ڈپٹی صاحب نے عزت سے اپنے پاس کرسی دی۔

اجلاس میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ آج تک کچہری میں، اتنی بھیڑ نہ ہوئی تھی۔
مقدمہ پیش ہونے میں کچھ بھی دیر نہ تھی۔ اسی وقت چمن لال کے
ایک آدمی نے اُن کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اُسی وقت "ایک ضروری کام
ہے" کہہ کر عدالت سے باہر چلے گئے۔
باہر آکر دیکھا۔ کہ تھوڑی دُور پر بڑ کے درخت کے نیچے ان کے والد
کھڑے ہیں۔ ننگے پاؤں رام نامی دوپٹہ اوڑھے۔ ہاتھ میں مالا لئے
جپ رہے ہیں۔ اُن کے چہرہ سے نُور ٹپکتا تھا۔
اچکن وغیرہ پہنے۔ چمن لال نے بڑی مشکل سے اپنے والد کو نمسکار
کی۔ اور پاس ہی ایک وکیل کے تخت پر چل بیٹھنے کے لئے کہا۔ مگر گوپی
نے جواب دیا۔
"نہیں۔ مَیں نے جو کچھ کہنا ہے۔ یہیں کھڑے کھڑے کہوں گا۔"
چمن لال پھر خاموش رہے۔
گوپی ناتھ پھر بولے۔ "رحیم کو چھڑانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اور
اس کی جائداد جو تم نے لے لی ہے۔ اُسے بھی واپس کرنا ہوگا۔"
چمن لال نے حیرانی سے دریافت کیا۔ "تو آپ اِسی لئے اتنی دُور
سے آئے ہیں؟ رحیم پر آپ کی اتنی عنایت کیوں ہے؟"
"یہ سُن کر کیا کرو گے" ـــــــ گوپی ناتھ نے سنجیدگی سے جواب دیا

چمن لال نہ مانا۔ اور بولا ــــــ "ناتجربہ کاری کا خیال کر کے کتنے ہی لوگوں کی زمینیں مَیں نے واپس لے لی ہیں۔ ان میں بہت سے براہمن بھی تھے۔ مگر آپ نے اُن کے متعلق تو کوئی دست اندازی نہیں کی۔ اور اس مُسلمان چھوکرے کے لئے آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی مقدمہ چلا کر اگر مَیں رحیم کو چھوڑ دوں۔ یا زمین واپس کر دوں۔ تو لوگ کیا کہیں گے؟"

گوپی ناتھ کچھ دیر تک خاموش رہے اور اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے مالا پھیرتے ہوئے بولے۔ "اگر لوگوں کے روبرو سب خلاصہ کہنا ضروری ہو۔ تو ان کو کہنا ــــــ رحیم تمہارا بھائی ہے۔ میرا بیٹا ہے۔"

چمن لال نے چونک کر کہا۔ "مُسلمانی کے پیٹ سے؟"

"ہاں"۔

چمن کافی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا۔ اس کے دماغ میں خیال پیدا ہوا۔ کیا شعلۂ نفس کے زیرِ اثر انسان اندھا ہو جاتا ہے؟ پھر اس نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ پہلے گھر چل کر آرام کریں۔ یہ سب بعد میں ہو جائے گا"۔

گوپی ناتھ نے کہا۔ "نہیں۔ مَیں اب گھر نہیں جاؤنگا۔ بلکہ ابھی یہاں سے ہی لوٹتا ہوں۔ تم جو مُناسب سمجھو کرو۔"

یہ کہہ کر وہ چل پڑے ۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور
جسم کانپ رہا تھا ۔
چمن لال کسی نتیجہ پر نہ پہنچے ۔ والد سے کیا کہنا چاہئے ۔ مگر یہ بات
اُن کے ذہن میں آ گئی ۔ کہ پہلے زمانہ کا دھرم ایسا ہی تھا ۔ علم اور
چال چلن میں اُنہوں نے اپنے آپ کو والد سے بہت اُوپر
پایا ۔ اُن کو یقین ہو گیا ۔ کہ ایک اصُول نہ ہونے سے ایسا ہی ہوتا ہے"۔
عدالت میں جب وُہ آئے تو دیکھا کہ رحیم دو سپاہیوں کے درمیان
ہتھکڑی پہنے بیٹھا ہے ۔ اس کا جسم کمزور ہو رہا ہے ۔ ہونٹ خشک ہو
گئے ہیں ۔ مگر آنکھوں سے شرافت اور اعلیٰ خاندانی ٹپک رہی ہے ۔
ایک گندی قمیض پہنے ہوئے ہے ۔ اور چمن لال کا بھائی ہے"۔
چونکہ چمن لال کی ڈپٹی کلکٹر سے دوستی تھی ۔ اس لئے بات بنا کر مقدمہ
خارج کرا دیا ۔ کچھ دِنوں بعد رحیم کی حالت پھر پہلی سی ہو گئی ۔ مگر اس کا
سبب اسے بھی معلوم نہ تھا کہ یہ چھٹکارا کیسے ہوا ۔ اور چمن لال نے سب
زمین وغیرہ کیوں واپس کر دی ۔ دُوسرے دن لوگوں کو بھی اس
بات سے حیرانی ہوئی ۔
مقدمہ کے دن گوپی ناتھ کے آنے کی خبر آناً فاناً سارے گاؤں
میں پھیل گئی ۔ لوگ اس بات کو لے کر کانا پھوسی کرنے لگے ۔

رام لال وکیل کو گوپی ناتھ نے اپنے خرچ سے پڑھا لکھا کر اس درجہ تک پہنچایا تھا۔ کہ وہ آج وکیل کہلانے لگا۔ اس کو اس بات کا شک تھا۔ لیکن آج۔۔۔۔۔ اُس نے بخوبی سمجھ لیا کہ اچھی طرح بال کی کھال اُتارنے سے سب مہاتماؤں کے پوشیدہ راز کھولے جا سکتے ہیں۔ کوئی چاہے جتنی مالا جپے۔ دُنیا میں سب میرے ایسے ہی ہیں۔ دُنیا میں سادھوؤں اور عام انسانوں میں یہی فرق ہے۔ کہ سادھو لوگ چالاک ہوتے ہیں۔ اور عام لوگ عام خیالات کے ہوتے ہیں۔ سادھو لوگ چھپا کر پاپ کرتے ہیں۔ اور عام لوگ کُھلے طور پر۔ غرضیکہ رام لال نے گوپی ناتھ کی مہربانیوں اور خیراتوں کے اصُول کو ایک ڈھونگ ٹھہرا کر اس راز کا حل کر لیا۔

تم نے ہزار شرم سہی ہم نے لاکھ ضبط
وہ رازِ عشق ہے کہ چھپایا نہ جا سکا

شعلهٔ انتقام

افسانهٔ نمبر ۵

تمہارا جال

اے میرے مالک! نا معلوم تم کس طرح گاتے ہو۔ مَیں تو حیرت سے خاموش ہمیشہ خاص توجہ سے سُنا کرتا ہُوں۔

تمہارے نغمہ کا نُور تمام عالم کو منوّر کرتا ہے۔ تمہارے گانے کی لہر زمین و آسمان میں ایک گُونج پیدا کر رہی ہے۔ تمہارے گانے کی آبشار پتھریلی رکاوٹوں کو کاٹتی ہُوئی تیزی سے بہہ رہی ہے۔

میرا دل تمہارے گانے میں شامل ہونے کو بہت چاہتا ہے لیکن کوشش کرنے پر بھی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ مَیں بولنا چاہتا ہوں۔ مگر آواز نغمہ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی۔ بس مَیں اپنی شکست تسلیم کرتا ہُوں۔

اے میرے مالک! تم نے میرے دل کو اپنے گانے کے جال میں پھانس لیا ہے۔

شعلۂ انتقام

شکست کھائے ہوئے شاہِ شجاع ۔جب اورنگ زیب کے خوف سے بھاگ کر اراکان کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوئے۔ تو ان کے ساتھ ان کی تینوں خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں ۔اراکان کے راجہ کی خواہش ہوئی کہ اس کے تینوں شہزادوں کی شادیاں۔ ان تینوں لڑکیوں سے ہو جائیں ۔ انہوں نے اپنی خواہش شاہِ شجاع پر ظاہر کی ۔جسے سُن کر وہ بہت ناراض ہوئے۔

ایک دن راجہ نے زبردستی شاہ اور اس کی بیٹیوں کو کشتی میں بٹھا کر ندی میں ڈبونے کی سازش کی۔ اس مصیبت کے وقت شاہ نے

سب سے چھوٹی لڑکی امینہ کو اپنے ہاتھوں بہتی ندی میں پھینک دیا۔ بڑی لڑکی نے خودکشی کرلی۔ منجھلی لڑکی زلیخا کو شاہ کا ایک وفادار ملازم جس کا نام رحمت تھا۔ تیر کر لے بھاگا۔ اور شاہ خود لڑکر وہیں جان بحق ہوئے۔ امینہ پانی کے بہاؤ کی طرف بہتی بہتی ایک ماہی گیر کے جال میں جا پھنسی۔ وہ اسی ماہی گیر کے ہاں پرورش پاکر جوان ہوئی۔

ایک دن صبح ہی ماہی گیر نے امینہ سے کہا "آج تجھے کیا ہوگیا ہے۔ تم نے کچھ کام ہی نہیں کیا۔ میرا نیا جال کہاں ہے؟ میری وہ لگی اُٹھا کر ناؤ پر نہیں رکھی۔"

امینہ نے ماہی گیر کے پاس آکر مودّبانہ کہا۔ "میری بہن آئی ہوئی ہے۔ اس لئے آج کام سے چھٹی کی ہے۔"

ماہی گیر نے حیرانی سے پوچھا ––– "تیری کون بہن؟"

زلیخا نہ معلوم کہاں سے نکل آئی۔ اور بولی "مَیں ہوں۔"

ماہی گیر سناٹے میں آگیا۔ اس کے بعد زلیخا کے بہت قریب جاکر اُسے اچھی طرح دیکھا۔

پھر سب سے پہلے یہی سوال کیا ––––– "تم کچھ کام کاج بھی جانتی ہے؟"

امینہ نے کہا "بہن کی طرف سے مَیں کام کردوں گی۔ وہ کچھ کام

نہ کریں گی۔"

ماہی گیر کچھ سوچ کر زلیخا سے بولا ——"ہاں تو تم رہو گی کہاں؟"

"امینہ کے پاس۔"

ماہی گیر نے سوچا۔ یہ بڑی آفت ہوئی۔ اس نے پھر سوال کیا۔

"کھاؤ گی کیا؟"

"اس کا کوئی فکر نہیں"۔ کہہ کر زلیخا نے لاپرواہی سے ایک اشرفی ماہی گیر کی طرف پھینکی۔ امینہ نے وہ اشرفی اُٹھا۔ ماہی گیر کو دی۔ اور آہستہ سے کہا ——"ماہی گیر اور کچھ مت کہنا۔ کام پر جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

زلیخا خفیہ طور پر گھومتی پھرتی آخر میں امینہ کے پاس ماہی گیر کے جھونپڑے میں آگئی۔ اس کے گذشتہ حالات لکھنے سے ایک دُوسری کہانی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کے محافظ نے نام بدلکر اراکان کی ریاست میں نوکری کر لی تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ندی کے کنارے کیلوُ کے پھول کی پنکھڑیاں گِر گِر کر ندی کو لال کر رہی تھیں۔

اسی درخت کے نیچے زلیخا نے امینہ سے کہا "ابا جان کی موت کا بدلہ چکانے ہی کے لئے خُدا نے ہم دونوں بہنوں کو زندہ رکھا ہے۔

اس کے علاوہ تو مجھے کوئی اور سبب نظر نہیں آتا۔ میرے دل میں انتقام کی جوالا اُٹھ رہی ہے؟"

امینہ نے ندی کے دُوسرے کنارے کی طرف دیکھتے دیکھتے "بہن یہ باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ مجھے اس دُنیا سے ایک طرح کی محبّت ہو گئی ہے۔ مرد چاہے خُون خرابا کرکے مریں مگر مجھے اس جگہ کوئی تکلیف نہیں۔"

"چھی چھی۔ امینہ تو شہزادی ہے۔ ذرا سوچ تو سہی۔ کہاں دہلی کا تخت اور کہاں اس ماہی گیر کی جھونپڑی؟"

امینہ نے ہنس کر کہا۔ "بہن! اس ماہی گیر کی جھونپڑی اور کیلوں کے درخت کی چھایا۔ اگر کسی لڑکی کو دہلی کے تخت سے اچھی معلوم ہو۔ تو دھلی کا تخت ایک آنسو بھی نہ گرائے گا۔"

زلیخا کچھ کھسیانی سی ہو کر بولی "تمہارا کوئی قصُور نہیں ہے۔ تم اس وقت بالکل ننھّی سی تھیں۔ لیکن ذرا سوچ تو سہی۔ ابّا جان تجھے ہی سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اسی لئے تجھے اپنے ہاتھوں سے ندی میں ڈال دیا تھا۔ اس زندگی کو اس باپ کی دی ہوئی موت سے زیادہ مت سمجھ۔ اگر تو باپ کا بدلہ نہ لے سکے۔ تو تمہارا جینا بے کار ہے۔ تمہیں مرجانا ہی بہتر ہے۔"

امینہ دُوسری طرف دیکھتی رہی۔ زلیخا نے بھانپ لیا کہ اس نے اس کی باتوں پہ کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا دل کسی خاص خوش کن خواب کا مزا لے رہا ہے۔ وہ اپنی نئی جوانی میں مست نامعلوم کیا سوچ رہی ہے۔ امینہ نے کچھ دیر بعد کہا: "بہن مَیں ذرا گھر کا کام کر آؤں؟ اگر مَیں نہ پکاؤنگی۔ تو ماہی گیر بھُوکا ہی رہ جائے گا۔"

امینہ کی یہ حالت دیکھ کر زلیخا بہت اُداس ہوئی۔ وُہ بیٹھی بیٹھی اس کی حالت پر غور کرنے لگی۔ اسی وقت اچانک ہی درخت سے کسی کے کُود نے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

زلیخا نے ڈرتے ہوئے پُوچھا "کون ہے"؟

آواز سُن کر زلیخا کی آنکھوں پر سے ہاتھ اُٹھا کر نوجوان اس کے سامنے آگیا۔ نوجوان نے بغیر کسی خوف سے زلیخا سے پُوچھا: "تم تو امینہ نہیں ہو۔ غلطی ہوئی۔ مُعاف کیجئے گا۔"

زُلیخا۔ اپنے کپڑے سنبھال کر غرُور کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے کڑی نگاہ سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور پُوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"تم مجھے نہیں جانتی۔ امینہ جانتی ہے۔ امینہ کہاں ہے؟"

اس شور و غُل کو سُن کر امینہ وہاں آگئی۔ زُلیخا کا غصّہ اور اُس

نوجوان کو ہنستے دیکھ کر وُہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

امینہ نے زلیخا سے کہا" بہن اس کی باتوں کا غصّہ نہ کرنا۔ یہ آدمی تھوڑا ہے۔ یہ تو ایک جنگلی ہرن ہے۔ اگر اس نے کچھ بے ادبی کی ہو۔ تو مَیں اسے سزا دُونگی ـــــ دالیا! تم نے کیا کیا ہے"؟

دالیا (یہ اس نوجوان کا نام ہے) جھٹ بول اُٹھا۔ مَیں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ مَیں سمجھا کہ تم بیٹھی ہو۔ لیکن وہ تُم تو نہیں ہو"

امینہ نے غصّہ ظاہر کرتے ہوئے کہا "کیوں بکتے ہو۔ تُم نے امینہ کی آنکھیں بند کی تھیں۔ تمہاری اتنی ہمت"!

نوجوان نے کہا۔ "آنکھیں بند کرنے میں تو ہمّت کی ضرورت نہیں۔ جبکہ پہلے ہی سے اس کی عادت ہو۔ لیکن امینہ میں اِن کو دیکھ کر ڈر تو بہت گیا تھا"

"نہیں! تم بہت ہی گنوار ہو ـــــ امینہ نے کہا ـــــ تمہیں شہزادی کے سامنے کھڑا ہونا بھی نہیں آتا۔ تجھے مَیں مودبانہ پیش آنے کی تعلیم دُوں گی۔ دیکھ اِس طرح سلام کرو"

امینہ نے اپنی نازک کمر کو جُھکا کر بتلایا اور دالیا نے بڑی مُشکل سے اس کی نقل کی۔ اس کے بعد امینہ نے اس کو چار قدم پیچھے ہٹ کر سلام کرنے کو کہا۔

دالیا نے حکم سنتے ہی پھر سلام کیا۔ اسی طرح امینہ اس کو پیچھے ہٹاتی ہٹاتی جھونپڑی کے دروازہ تک لے گئی۔

دُوسری جھونپڑی کا دروازہ دِکھلا کر امینہ نے دالیا سے کہا۔ "اس کے اندر چلو"۔ دالیا اس کے اندر چلا گیا۔ امینہ نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ "ذرا گھر کا کام کرو۔ آگ جلا دو" کہہ کر۔ اپنی بہن کے پاس جا پہنچی۔

امینہ نے زلیخا سے کہا: "بہن غصّہ نہ کرنا۔ یہاں کے آدمی اسی طرح کے ہیں۔ مَیں تو اس کی جہالتوں سے تنگ آ گئی ہوں"۔

لیکن امینہ کے چہرے پر ان باتوں سے صداقت ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی باتوں سے تو وہاں کے لوگوں سے ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔

زلیخا نے خفگی سے کہا: "امینہ تیرا حال دیکھ کر مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ ایک اجنبی نوجوان کی یہ جرأت کہ وہ تیرے بدن کو ہاتھ لگائے"۔

امینہ اپنی بہن کی بات کاٹ کر بولی۔ "ہاں بہن! اگر کسی بادشاہ یا نواب کا لڑکا۔ ایسی حرکت کرتا تو وہ ضرور بے عزتی سے ٹھکرایا جاتا"۔

زلیخا سے ہنسی رو کی نہ گئی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ "سچ کہو امینہ! کیا اسی گنوار کے لئے ہی تجھے اس زمین سے محبّت ہو گئی ہے۔

"سچ ہے۔ بہن۔ یہ آدمی میرے بڑے کام آتا ہے۔ آگ جلا دیتا

ہے۔ گھر کا کام کر دیتا ہے۔ غرضیکہ کسی کام کے لئے پکارو۔ بھاگا آتا ہے۔
مَیں اکثر ارادہ کرتی ہوں۔ کہ اس کی جاہلانہ حرکتوں کی سزا دُوں۔
مگر اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی۔ اگر کبھی آنکھیں دِکھاتی
ہوں تو کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے۔ اس مُلک میں شاید ایسے ہی ہنسی
کی جاتی ہے۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ اگر دو گھونسے بھی مار
دیئے جائیں۔ تو یہ بہت خوش ہو جاتا ہے۔ دیکھو نہ اس جھونپڑے
میں بند کر رکھا ہے۔ اس سے وہ بہت ہی خوش ہوگا۔ دروازہ کھول
کر دیکھ لو۔ وہ خوشی کے ساتھ آگ سُلگا رہا ہوگا۔ مَیں کیا کروں بہن؛
اس پر نامعلوم میرا زور کیوں نہیں چلتا؟"

زلیخا نے کہا۔ "اچھا مَیں کوشش کر کے دیکھوں گی؟"

امینہ نے ہنس کر بڑی عاجزی سے کہا "بہن! مَیں تیرے پاؤں
پڑتی ہوں۔ اُسے کچھ نہ کہنا"

امینہ نے یہ بات ایسے کہی۔ جیسے واقعی وہ نوجوان اس کا پالتو
ہرن ہے۔ ابھی تک اس کا جنگلی پن دُور نہیں ہوا۔

اُسی وقت ماہی گیر نے آکر پُوچھا "آج والیا نہیں آیا؟"

"آیا ہے"

"کہاں گیا؟"

"وہ بڑا اُدھم مچا رہا تھا۔ اِس لئے اسے کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔"

ماہی گیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اگر وہ تمہیں تنگ کرتا ہو۔ تو خفا مت ہونا۔ اس عمر میں انسان ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ اسے ڈانٹنا مت ——— دالیا نے کل ایک اشرفی دے کر مجھ سے تین مچھلیاں لی تھیں"

امینہ نے کہا۔ "فکر مت کرو۔ مَیں آج اُسے ایک مچھلی دے کر دو اشرفی وصول کر لوں گی۔"

اپنی پالی ہوئی لڑکی کو اتنی عمر میں چالاک اور ہوشیار دیکھ کر ماہی گیر بہت خوش ہوا۔ اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا چلا گیا۔

حیرانی کی بات ہے کہ کچھ دن بعد دالیا کے آنے جانے سے زلیخا کے حالات بدل گئے۔ اگر کچھ سوچ کر دیکھا جائے۔ تو اس میں حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ ندی میں جیسے ایک طرف بہاؤ ہوتا ہے اور دوسری طرف کنارہ۔ اِسی طرح عورت کے دل میں جوش اور دوسری طرف دُنیا داری ہوتی ہے۔ لیکن دُنیا کے ایک طرف بسنے والے اراکان میں دُنیا دار کہاں؟

وہاں صرف ہر موسم میں درخت پھُول لتے ہیں۔ سامنے کی ندی

برسات میں بڑھ کر سردیوں میں صاف رہ کر اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہو کر اپنی بہار دکھلاتی ہے۔

یہاں رہتے زلیخا کو دو برس ہو گئے۔ مگر کبھی کبھی پھر بھی سوچتی۔ کہ شہزادی کی زندگی کیا یونہی گذرنی چاہیئے؟

ایک دن صبح دالیا کے آتے ہی زلیخا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "دالیا کیا تم یہاں کے راجہ کو دکھلا سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔ کیا کام ہے؟"

"میرے پاس ایک چھرا ہے۔ میں وہ اس کی چھاتی میں گھونپ دینا چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر پہلے تو دالیا حیران ہوا۔ اس کے بعد زلیخا کے خدوخال دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس نے ایسا مذاق پہلے کبھی نہیں سنا۔ اگر دل لگی بھی ہو۔ تو شہزادی کے ہی لایق ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھر ہنسنے لگا

دوسرے دن زلیخا کے پاس رحمت علی کا ایک خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ ارکان کے راجہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں شہزادیاں ماہی گیر کے ہاں رہتی ہیں۔ وہ چھپ کر امینہ کو دیکھ آئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ اب بہت جلد ہی اُس سے شادی کی

تیاریاں کر رہے ہیں۔ انتقام لینے کا موقعہ اس سے اچھا نہیں ہو سکتا۔

زلیخا نے مضبوطی سے امینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "خدا کی مرضی صاف معلوم پڑتی ہے۔ امینہ۔ اب اس سے اچھا موقعہ پھر نہ ملے گا۔ اس لئے اپنی زندگی کا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ اب یہ کھیل کود میں پھنسے رہنا اچھا نہیں"۔

دالیا وہیں کھڑا تھا۔ امینہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ہنس رہا تھا۔

امینہ نے اُسے ہنستے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "جانتے ہو دالیا میں رانی بننے جا رہی ہوں"

دالیا نے کہا "مگر بہت دیر کے لئے نہیں"

امینہ نے سوچا۔ واقعی یہ جنگلی ہرن ہی ہے۔ اس کے ساتھ انصاف کرنا میرا پاگل پن ہے۔ امینہ نے دالیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں راجہ کو مار کر پھر زندہ واپس آ سکوں گی"؟

دالیا نے اپنی بات کو ٹھیک سمجھتے ہوئے کہا "ہاں واپس آ جانا ہی بہتر ہے"

زلیخا کی طرف پھر کر اس نے کہا "بہن میں تیار ہوں"

پھر دالیا کی طرف دیکھ کر بولی "رانی ہوتے ہوئے ہی میں

راجہ کے خلاف کارروائی میں شامل ہونے کے قصور میں تمہیں سزا دوں گی"۔

دالیا نے سمجھا۔ شاید یہ بھی مذاق ہے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ہنسنے لگا۔

سوار۔ پیدل۔ جھنڈے۔ ہاتھی۔ باجے اور روشنی کے سامان سے ماہی گیر کا گھر بھر گیا۔ راجہ کے محل میں دونوں شہزادیوں کو لے جانے کے لئے دو پالکیاں بھی آئیں۔

امینہ نے زلیخا کے ہاتھ سے چھری لی۔ اس کی مٹھ پہ ہاتھی دانت کی کاریگری کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر یکا یک اپنی انگیا میں چھپا لی۔

امینہ کی بڑی خواہش تھی کہ جانے سے پہلے ایک دفعہ دالیا سے ملتی۔ لیکن وہ کل سے لاپتہ تھا۔ تو کیا دالیا کی اس ہنسی میں روٹھنا چھپا تھا؟

امینہ نے پالکی میں چڑھنے سے پہلے اپنے محافظ کے جھونپڑے پر نظر ڈالی۔ اپنے جھونپڑے کے اردگرد کے درختوں اور ندی کو دیکھا۔ ماہی گیر کی طرف دیکھ کر خوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور کہا "بابا۔ میں جاتی ہوں"۔

امینہ تو جاتی ہے، اب تیرے گھر کا کام کون کرے گا؟
ماہی گیر بچّے کی طرح رو اُٹھا۔
"ماہی گیر۔ اگر دالیا یہاں آئے۔ تو اُسے یہ انگوٹھی دے دینا۔
کہنا۔ امینہ جاتے وقت دے گئی تھی۔"
انگوٹھی دے کر امینہ جلدی سے پالکی پر سوار ہو گئی۔ بڑی شان وشوکت سے دونوں پالکیاں محل کی طرف چلیں۔ امینہ کے رہنے کا جھونپڑا۔ ندی کنارہ اور پھول آنسو بہا رہے تھے۔ آخر دونوں پالکیاں محل کی ڈیوڑھی پر جا رکیں۔ دونوں بہنیں پالکیوں سے اُتر پڑیں۔ امینہ کے مُنہ پر ہنسی یا آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ زلیخا کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔
فرض جب تک دُور تھا۔ تب تک زلیخا کو حوصلہ تھا۔ مگر اس وقت اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ محبت سے بیتاب زلیخا نے بہن کو چھاتی سے لگا لیا۔ اپنے دل میں کہنے لگی۔ نئی محبت کے گُچھے سے توڑ کر میں اس کھلے پُھول کو کس خُون کی ندی میں بہانے لگی ہوں؟
لیکن اب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ ہزاروں لونڈیاں ہاتھوں میں روشنی لئے راستہ دکھاتی آگے جا رہی تھیں۔ اور ان کے پیچھے دونوں بہنیں۔ پس پردہ
راجہ کے محل کے دروازہ پر پہنچ کر امینہ نے زلیخا سے کہا "بہن!"

زُلیخا نے اس کا مُنہ چُوم لیا۔

دونوں نے محل کے اندر قدم رکھا۔

کمرے کے اندر ایک عالیشان پلنگ پر بادشاہی پوشاک پہنے راجہ بیٹھے تھے۔ امینہ شرم سے دروازہ کے پاس کھڑی ہوگئی۔

زلیخا نے آگے بڑھ کر راجہ کے پاس پہنچ کر دیکھ ہنس رہے تھے۔

زلیخا کہہ اُٹھی ——"دالیا"۔

امینہ بے ہوش ہوگئی۔ زخمی پرندکی طرح گر پڑی۔ امینہ کو گود میں اُٹھا کر دالیا پلنگ پر لے گیا۔ ہوش آنے پر امینہ نے انگیا سے چُھری نکال کر بہن کی طرف دیکھا۔ بہن نے دالیا کی طرف دیکھا۔ دالیا ہنستے ہنستے دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور چُھری بھی میان سے نکل کر یہ تماشا دیکھ کر ہنسنے لگی۔ شعلہ انتقام دالیا کی ہنسی میں سرد ہو چکا تھا۔

مین آپکی رشتے سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ یہ بالکل غلط ہے

ملخص

شعلۂ غم

افسانہ نمبر ۶

روانگی

مجھے اجازت مل گئی ہے۔ اے بھائیو! مجھے جانے دو۔ میں تم
سب کو پرنام کرتا ہوں۔

یہ لو میرے دروازے کی چابیاں۔ میں اپنے گھر کی تمام ملکیت
کو خیرباد کہتا ہوں۔ اور تم سے صرف آخری میٹھے الفاظ کی خواہش
کرتا ہوں۔

ہم کافی دیر تک پڑوسی بن کر رہے۔ لیکن میں نے جتنا لیا اتنا
دے نہ سکا۔ بس سورج نکلا ہے۔ اور وہ چراغ گل ہو گیا جس سے
میرے اندھیرے کونے میں روشنی ہوتی تھی۔ مجھے طلب کیا گیا ہے۔
اور میں سفر کے لئے تیار ہوں۔

شعلۂ غم

مدن ایک کلرک تھا۔ اُسے دُنیا کے عیش و آرام سے دُور کا بھی رشتہ نہ تھا۔ اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ دُنیا میں عیش و عشرت بھی کوئی ضروری یا غیر ضروری چیز ہے۔ اس کی عُمر کا صرف ایک مقصد تھا ـــــ بس جس طرح ایک بیل آنکھیں مُوندھے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ویسے ہی مدن بھی اپنے کام میں ہی لگا رہتا تھا۔

صبح اُٹھتا۔ حقّہ ہاتھ میں لیتا۔ اور ننگے بدن گلی کے چبوترے پر جا بیٹھتا۔ طرح طرح کے آدمی آتے جاتے۔ گھوڑا گاڑیاں چلتیں بھکاری گاگا کر بھیک مانگتے۔ انہی سب باتوں سے وہ اپنا دل بہلایا کرتا۔

۹ بجے کے قریب اُٹھتا ۔ بدن پر تیل کی مالش کرتا ۔ غسل کرتا اور کھانا کھا کر دفتر چلا جاتا ۔ دفتر سے واپسی پر اپنے ہمسایہ بہاری کی بیٹھک میں شام تک بیٹھا اخبار بینی کرتا رہتا ۔ کھانے کے وقت گھر آتا ۔ کھانا کھاتا اور سو رہتا ۔ یہی اس کا معمول تھا ۔

اُسی دوران میں مدن کی بیوی رُوپا سخت بیمار ہو گئی ۔ بخار کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا ۔ ڈاکٹر جتنی کوشش بخار اُتارنے کی کرتا بخار اتنے ہی زور سے ہوتا ۔ اسی حالت میں رُوپا چالیس دن تک بستر پہ پڑی رہی ۔

مدن کا دفتر جانا بند تھا ۔ بہاری کے بیٹھک خانہ میں بھی کئی دنوں سے نہ گیا تھا ۔ وہ بہت ہی بدحواس ہو گیا ۔ دن میں کئی کئی دفعہ روپا کے پاس جاتا ۔ بیمار پُرسی کرتا ۔ اور باہر آ کر حقّہ کے کش لگانے میں مصروف رہتا ۔ ڈاکٹر روزانہ آتا ۔ دوائی بدلتا ۔ غرضیکہ رُوپا کی صحت کے لئے وہی ہوتا ۔ جو ڈاکٹر کہتا

خُدا خُدا کر کے رُوپا صحت یاب ہوئی ۔ مگر جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ۔ ایک قدم بھی بغیر کسی مدد کے نہ چل سکتی تھی ۔

بسنت کا موسم آ گیا ۔ موسم میں تبدیلی واقع ہوئی ۔ سرد ہوا نے قدرے گرمی پکڑی ۔

رُوبا کے کمرہ کے نیچے ہی پڑوسی گھر کا ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ مگر اُجڑا ہوا۔کسی وقت کسی نے شوق سے کئی قسم کے پھولوں کے پودے لگائے تھے۔مگر بعد میں اُن کی طرف خیال نہ کیا۔ایک طرف کئی قسم کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔بڑے بھاری بڑ کے درخت کے نیچے گھاس پھوس کا جنگل سا بنا ہوا تھا۔باورچی خانہ کے پاس کی دیوار خستہ حالت میں تھی۔اور اس کی گری ہوئی اینٹیں پاس ہی بکھری پڑی تھیں۔

ان دنوں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس لیٹ کر رُوبا اُسی باغیچہ کو دیکھ کر دل بہلاتی تھی۔اُس وقت جب مدن اس کے پاس بیٹھ کر پُوچھتا "کیوں طبیعت کیسی ہے؟" تب اس کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔بیماری کے سبب پچکے ہوئے چہرہ میں اس کی آنکھیں بہت بڑی معلوم پڑتی تھیں۔اُنہیں بڑی بڑی پُر محبت آنکھوں سے مدن کی طرف دیکھتی ہوئی۔اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ لیٹی رہتی تھی۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ایک دن ٹوٹی دیوار کی ایک دراز سے نکلے ہوئے۔چھوٹے سے پیپل کے پودے کی شاخوں سے جھانکتا ہوا چاند۔آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔شب کی خوبصورتی میں کچھ کچھ

ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اسی وقت مدن کے سر کے بالوں کو انگلیوں سے الجھتی ہوئی۔ رُوپا بولی ''میرے تو اولاد ہی نہیں۔ تم دُوسرا بیاہ کر لو۔''

رُوپا کئی دِنوں سے یہی بات سوچ رہی تھی۔ دل جب خوشی میں ہوتا ہے۔ یا کسی کی سچی اُلفت کی یاد میں تڑپتا ہے۔ تب انسان سوچتا ہے کہ مَیں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تو اچانک ہی کسی قسم کی قربانی دِکھانے کا خیال شعلہ زن ہو اُٹھتا ہے۔ دریا کی لہریں جیسے ہی کناروں سے ٹکراتی ہیں۔ ویسے ہی محبّت کا جوش۔ انتہا کی خوشی اپنے آپ کو مصیبت پر نچھاور کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

ایسی ہی حالت میں ایک دن محبّت بھرے دل سے روپا نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اپنے خاوند کے لئے کوئی بڑی بھاری قربانی کرے گی۔ لیکن جتنی خواہش ہوتی ہے۔ اتنی طاقت کس میں ہوتی ہے۔ ہاتھ میں کیا ہے۔ کیا دیا جائے۔ دولت نہیں ہے۔ عقل نہیں ہے۔ صرف ہے تو زندگی ہے۔ اُسے، اگر خاوند پر قربان کرنا پڑے۔ تو بھی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس زندگی کی بھی کیا قیمت ہے؟

پھر روپا سوچتی ــــــ ''اگر مَیں اپنے خاوند کو خوبصورت بچہ

دے سکتی۔ لیکن یہ تو مَیں جان دینے پر بھی نہیں کر سکتی۔ تب رُوپا
کو یہ خیال آیا کہ وُہ اپنے خاوند کی دُوسری شادی تو کرا سکتی ہے۔
اس خیال سے وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

مدن نے جب بیوی کے مُنہ سے اپنی دُوسری شادی کا ذکر
سُنا۔ تو اُس نے اس بات کو ہنسی میں اُڑا دیا۔ دُوسری تیسری دفعہ
ذکر آنے پر بھی جب اُس نے ادھر توجہ نہیں کی۔ تب خاوند کا
اس معاملہ میں انکار اور بے رُخی دیکھ کر رُوپا کو جتنی خوشی اور
راحت نصیب ہوئی۔ اس سے دوچند مدن کا دُوسری شادی
کرانے کا ارادہ بڑھتا گیا

ادھر اپنی بیوی سے کئی دفعہ یہ ذکر سُن کر۔ مدن کو یقین ہو
گیا کہ دُوسری شادی کا ہونا۔ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اِسی
لئے آہستہ آہستہ اُن کا دل اولاد کے لئے تڑپنے لگا۔

ایک دن خود ہی اس کا تذکرہ کر بیٹھا ——" بڑھاپے میں
مَیں اپنے گھر بیٹے کا مُنہ نہ دیکھ سکوں گا"۔

"اس کے لئے تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ——
اس کا ذمہ مَیں اپنے سر لیتی ہوں"۔

روپا کے خیال میں ایک دوشیزہ قابلِ شادی تھی۔ اسے یاد

کر کے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔

مدن نے کہا "میری ملازمت ہے۔ تم ہو۔ نئی بیوی کو بہلانے کی فرصت اور خواہش نہیں ہے"۔

رُوپا نے کئی دفعہ کہا "اس کے۔ لئے تمہیں ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا ہوگا"۔ اور آخر کار دل لگی کے طور پر کہا "اچھا اُس وقت دیکھونگی تمہاری فُرصت"۔

ایک نو عمر سے بچّی عمر کے مدن کی شادی ہوگئی۔ اس کا نام تھا ـــ "لیلا!"

مدن نے سوچا کہ نام بھی بہت اچھا ہے۔ اور چہرہ بھی خوبصورت ہے۔ وہ اس کی ہر ادا پر دیوانہ ہوگیا۔ ہر وقت اسی کے پاس بیٹھنے کی خواہش رہنے لگی۔ مگر روپا کے سامنے اپنی سب خواہشات کو دبانا ہی پڑتا۔ ظاہرا طور پر تو وہ یہ دکھلا رہا تھا۔ کہ اس نے یہ شادی کر کے مصیبت مول لی ہے۔

روپا ـــــ مدن کے خیالات کو بھانپ گئی تھی۔ وُہ بہت خوش تھی۔ کئی دفعہ اس نے مدن کا ہاتھ پکڑ کہا ـــ "بھاگتے کہاں ہو۔ یہ چھوٹی سی بیوی اچھی نہیں لگتی؟"

اُس وقت مدن اور بھی بے رُخی دِکھلا کر کہتا۔ "ارے چھوڑو

مجھے بہت ضروری کام ہے۔"
رُوپا ہنس کر دروازہ روک کر کہتی۔ "آج تُم بھاگ کر نہیں جا سکتے۔"
بے بس ہو کر مدن کو بیٹھنا ہی پڑتا۔
روپا اس کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر کہتی تھی۔ "غیر لڑکی کو گھر لا کر اس سے بدسلوکی مُناسب نہیں ہے۔"
یہ کہہ کر لیلا کو زبردستی مدن کے پاس بٹھلاتی۔ اور اس کا گھونگٹ کھول کر اور مُنہ اُونچا کر کے مدن سے کہتی ــــــ "دیکھو کیسا چاندسا چہرہ ہے۔"
روپا کسی دن تو دونوں کو ایک جگہ بٹھلا کر اور خود کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جاتی۔ اور باہر سے دروازہ بند کر دیتی۔ مگر مدن جانتا تھا کہ دروازہ کے سوراخوں سے ضرور کسی کی دو آنکھیں پوشیدہ طور پر اُسے دیکھ رہی ہوں گی۔ اس لئے وہ اُداس دل سے لیلا کی طرف کروٹ لے کر سونے کا بہانہ کرتا۔ اور لیلا گھونگٹ نکالے ایک طرف سر نیچا کئے اس تماشہ کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔
آخر کار رُوپا نے لاچار ہو کر اس بات کو چھوڑ دیا۔ جب رُوپا نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ تو مدن اس طرف راغب ہوا۔ جیسے ایک اسیر

کا ٹکڑا ملنے پر اُسے گھما پھرا کر دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ویسے ہی مدن
کو اس اُدھیڑ عمر میں ایسی دوشیزہ ملنے سے اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی
چھوڑنا مشکل ہو گیا۔

مدن کو اس سے قبل کبھی ایسا پُر عیش زمانہ نہ ملا تھا۔ پہلے جب
شادی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ نادان تھا۔ جب جوانی آئی۔ تو
رُدپا اس کے لئے ایک دیرینہ جان پہچان والی تھی۔ رُدپا سے اُسے
محبت ضرور تھی۔ لیکن کبھی اس کے دل میں حال کی طرح جذبات نہ
آئے تھے۔

کبھی کبھی پوشیدہ طور پر لیلا کے لئے پھل مٹھائی۔ وغیرہ بازار
سے لاتا۔ اسی طرح دونوں میں محبت بڑھنے لگی ایک دن ردپا نے
گھر کے کام کاج سے چھٹی پا کر کمرہ کے دروازوں سے دیکھا۔ دونوں
بیٹھے ہوئے چوپٹ کھیل رہے ہیں۔ بوڑھاپے کا ہی کھیل ہے۔
میں ہر روز انکو دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر بھی یہ۔
——اسے سوچا انکو چھپ کر اس دغا بازی کی کیا ضرورت تھی۔ جیسے
اچانک ہی کسی نے جلتی ہوئی سلاخ سے رُدپا کی آنکھیں کھولدی
اور اس کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔

ردپا نے دل میں کہا ——میں نے ہی مجبور کر کے شادی

کرادی۔ مَیں نے ہی دو دِل ملا دیئے۔ اور پھر مجھ سے ہی یہ دھوکا بازی۔ جیسے مَیں ہی ان کے عیش و عشرت میں ایک کانٹا ہُوں۔

رُوپا۔ ــــ لیلا کو گھر کا کام کاج سکھلاتی تھی۔ ایک دن مدن نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ــــــ وہ ابھی بچّہ ہے۔ تم اُس سے بہت مشقت لیتی ہو۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے۔

رُوپا کو بہت غصّہ آیا۔ مگر اپنے کو قابُو میں رکھ کر بالکل خاموش رہی۔

اُس دن سے رُوپا نے لیلا کو گھر کے کسی کام میں بھی ہاتھ لگانے دیا۔ کھانا وغیرہ سب خود ہی بناتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ لیلا مالکن کی طرح بیٹھی رہتی۔ اور رُوپا ایک نوکرانی کی طرح اس کی خدمت کرتی۔ رُوپا جب چپ چاپ گھر کا سب کام کرنے لگی۔ تو وہ فخر محسوس کرتی تھی۔ اس کے دِل میں کوئی حسد نہ تھا۔ اس نے دل میں کہا ــــــ

"تم دونوں بچّے مل کر کھیلو ــــ گھر کا سب کام کاج میں دیکھ لوں گی"۔

ہائے ــــــ آج کہاں گئی۔ وُہ طاقت۔ جس کے بھروسے پر رُوپا نے سوچا تھا کہ وُہ خاوند کے لئے۔ اس کی مسرت کے لئے۔ اپنی محبّت کا آدھا حق بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چھوڑ دے گی۔ یکایک اُبلدک

پورنیما کی رات کو جب دل میں محبت کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ تب انسان اپنی خواہشات کے سامنے کسی کو نہیں سمجھتا۔ تب جب وہ بڑی بھاری قربانی کرنے کی ٹھان لیتا۔ مگر محبت بھری لہروں سے بچنے کے لئے دل کو کام میں نہیں لا سکتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ انسان بہت ہی کمزور ہے۔

بہت دنوں کی کمزوری کے بعد کمزور رُندو یا اس دن شکل پکش کے چاند کی طرح ایک لاش سی معلوم پڑتی تھی۔ وُہ دُنیا میں بہت ہی بے عزت ہو کر اپنی زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر کچھ بھی نہ ہو تو میرا کام چل سکتا ہے۔ لیکن اب اب وہ توانا تھی۔ رگوں میں پھر سے خون آگیا تھا۔ اس دن اس کے دل نے کہا ـــــ کہ تم نے جوش میں آکر اپنی محبت کی قربانی دے دی ہے۔ مگر اب وہ اپنا دعوےٰ نہیں چھوڑ سکتی۔

رُندو یا نے جس دن اپنی حالت کو سمجھ لیا تھا۔ اسی دن اپنا کمرہ لیلا اور رمن کے لئے خالی کر دیا۔ اور خود ایک دُوسری کوٹھڑی میں رہنے لگی۔

پندرہ برس کی عمر میں پہلی دفعہ جس پلنگ پر قدم رکھا تھا۔ آج بیس برس بعد اسے ہمیشہ کے لئے لیلا کے حوالے کر دیا۔

گلی کے موڑ پر ایک نوجوان گانا گا رہا تھا۔ اس کا ساتھی بانسری بجا رہا تھا۔ یہ گانا بجانا۔ اس چاندنی رات میں پاس کے کمرہ میں پڑے ہوئے مدن کو بہت ہی پسند آیا۔ لیلا اس وقت میٹھی نیند میں سو رہی تھی۔ اور مدن بار بار "پیاری کیا سو گئی" کہہ کر اس کی متوالی آنکھوں کو نیند سے محروم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مدن کے بڑھاپے میں۔ جوانی کا جوش مارتا ہوا سمندر پوشیدہ تھا۔ موقع پا کر وہ اچانک ہی بے وقت ظاہر ہو گیا۔ مگر اس کی جوانی کا جواب دینے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اسی سبب سے اُس کے گھر کا انتظام اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ انسان کے دل کی حالت یکساں نہیں رہتی۔

صرف مدن کا ہی یہ حال نہ تھا۔ بلکہ رُوپا کو بھی ایک نئی حالت سے گذرنا پڑا۔ آج دل جو کرے تو چاہتا ہے۔ اُسے اُس نے اور کبھی نہیں پایا۔ اور نہ کبھی چاہا ہے۔ جب شریف آدمیوں کی طرح مدن ہر روز دفتر جاتا تھا۔ اور سونے کے پہلے کچھ دیر تک گھر کے کام کاج کے متعلق کچھ بات چیت کرتا تھا۔ تب تو اس گھریلو لڑائی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ رُوپا کو چاہتا تو ضرور تھا۔ مگر اس چاہنے میں جوش نہ تھا۔

آج دریا کو معلوم ہوا۔ کہ اُسے کوئی زندگی کے لطفوں سے دُور رکھے ہوئے ہے۔ اس کا دل ہمیشہ سے مرجھایا ہوا ہے۔ اس کی زندگی بڑی ہی غربی سے کٹی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ گھر کے کام کاج میں ایک نوکرانی کی طرح گذار دیا۔ آج اس نے محسوس کیا۔ اُس کی کوٹھڑی کے پاس ایک کمرہ میں عیش و عشرت کے سامانوں کا تالہ بڑی بے دردی سے توڑا گیا ہے۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی گھر کی مالک بنی بیٹھی ہے۔ عورت کا فرض خاوند کی خدمت کرنا تو ضرور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ گھر کی رانی بھی ہے۔ لیکن اس میں حصّہ دار بنا کر ایک عورت رانی اور دُوسری خدمت گار ہوئی۔ اس سے نوکرانی کا فخر قائم نہ رہا۔ اور رانی کا آرام نہ رہا۔

کیونکہ لیلا کو اپنی خواہشات دبانی پڑیں۔ لگاتار اتنی زیادہ عزت پاکر وہ اپنے کو بھول گئی۔ اُسے کسی کی عزت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سمندر کی طرف بہنے کی بجائے سمندر میں بہنے ہی میں دریا کو فائدہ ہے۔ لیکن اگر کہیں دریا میں بہنے لگے۔ تو دریا کا نقصان ہی ہے۔ اس سے دریا ٹھیک راستہ پر نہ جاکر ادھر ادھر سے چل کر پاس رہنے والوں کو تباہ کر دے گا۔ مدن اپنے دل کی سب محبّت لے کر دن رات لیلا کی طرف بہنے لگا۔ اسی سے لیلا غرور میں آگئی۔ اور اپنی جگہ سے چار قدم

آنگے ہی نکل گئی۔ خاوند کو چاہئے۔ اُس کی عزت کرنے کا وقت ہی اُسے نہ ملا۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ "سب کچھ میرے لئے ہی ہے۔ اور میں کسی کے لئے بھی نہیں ہوں"۔

ایک دن بادل خُوب زور سے گھرے ہُوئے تھے۔ آندھی اتنے زور سے چل رہی تھی۔ کہ گھر کے اندر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بڑ کے درخت کے پاس کا گھاس پانی میں ڈوب گیا تھا۔

رُوپا اکیلی کوٹھڑی میں بیٹھی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔

اسی وقت مدن چور کی طرح آہستہ آہستہ کوٹھڑی میں آیا۔ وہاں آکر وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ کہ رُوپا کے پاس چلوں یا واپس لوٹ جاؤں۔ رُوپا نے اس کی اس حرکت پر دھیان دیا۔ مگر خاموش رہی۔

تب مدن یکایک تیر کی طرح سیدھا اُس کے پاس پہنچا۔ اور پہنچتے ہی بولا۔ "کچھ زیوروں کی ضرورت ہے۔ قرضہ بہت چڑھ گیا ہے۔ مہاجن اس کے لئے بہت بے عزت کر رہے ہیں۔ کچھ چیزیں گروی رکھنی ہوں گی"۔

رُوپا ــــ نے کچھ جواب نہ دیا۔ مدن چور کی طرح کھڑا رہا۔ آخر بولا۔ "کیا آج دے سکتی ہو؟"

روپا نے کہا ـــــ "نہیں"۔

روپا کی کوٹھڑی میں جانا جیسے مشکل تھا۔ ویسے ہی اب مدن کیلئے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ مدن نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "اچھا تو کسی اور جگہ کچھ بندوبست کرنے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ قرضہ کس سے لیا ہے۔ اور کسے زیورات دینے ہونگے۔ یہ بات روپا کو اچھی طرح معلوم تھی۔ اس نے سُنا تھا۔ رات کو لیلا نے مدن سے تن کر کہا تھا ـــــ "رُوپا کے پاس اتنے زیور ہیں۔ مگر مجھے ایک بھی نہیں ملتا"۔

مدن کے چلے جانے کے بعد رُوپا نے لیلا کو بُلایا۔ صندوق کھول کر ایک ایک زیور نکالا۔ اور پھر اپنی شادی کی بنارسی ساڑھی لیلا کو پہنائی۔ اور اس کے بعد سر سے لے کر پاؤں تک کے ایک ایک زیور اُسے پہنا دیئے۔ یہ سب کچھ کر کے جب رُوپا نے لیلا کو ایک بار دیکھا۔ تو وہ بہت ہی خوبصورت دکھلائی پڑی

لیلا جب سب زیور پہن کر وہاں سے چھم چھم کرتی ہوئی چلی گئی۔ تب بہت دیر تک یہ چھم چھم کی آواز روپا کے ریشہ ریشہ میں گونجنے لگی۔ رُوپا نے اپنے دِل میں کہا ـــــ اور کس بات میں میرا اور تیرا مقابلہ ہوگا۔ ایک وقت تھا۔ جب مَیں بھی تیری طرح جوان تھی۔ ـــ میری نسوں میں بھی جوانی پھُوٹ رہی تھی۔ لیکن مجھے کسی نے پریم نہیں کیا۔

مگر تو ہے۔ کہ مجھ سے ایک بات کئے بغیر ہی ...... یہاں سے چلی گئی۔

رُوپا جب صرف گھر گرہستی کو ہی سب کچھ جانتی تھی۔ تب یہ زیور اُس کی نگاہ میں بڑے قیمتی تھے۔ اُس وقت بھلا وہ یہ زیور کسی کو ایسے ہی دے دیتی؟ لیکن اس وقت اُسے ان سب چیزوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

زیور پہن کر لیلا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دم بھر کے لئے بھی نہ سوچا ——— کہ رُوپا نے اُسے کیا دے دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ سب دولت اور سب عیش و آرام کی میں ہی مالک ہوں کیونکہ وہ اپنے خاوند کی چاہتی بیوی ہوں۔

کچھ لوگ عشق میں پھنس کر بُرا بھلا نہیں سوچتے۔ انہیں کچھ بھی نہیں معلوم پڑتا۔ وہ مصیبت کے بے رحم ہاتھوں میں خود بخود چلے جاتے ہیں اور آخر اس کے انجام پر آنکھیں کھلتی ہیں۔

نادان مدن کی بھی یہی حالت ہوئی۔ لیلا اس کی زندگی تھی۔ رُوح تھی۔ وہ اس کے لئے پاگل سا تھا۔ صرف مدن کی آمدنی سے ہی اب لیلا کے اخراجات پورے نہ ہو سکتے تھے۔ بلکہ پوشیدہ طور پر دفتر

کے کیش میں سے آہستہ آہستہ ضرورت پوری کرنے کے لئے بھی روپے آنے لگے۔ مدن یہی سوچتا ——— "کیا ہوا اگلے ماہ کی تنخواہ اس میں ڈال دیں گے۔ لیکن تنخواہ ہاتھ آتے ہی نہ معلوم کہاں غائب ہوجاتی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ کیش میں سے بہت سی رقم کم ہوگئی۔

آخر ایک دن راز فاش ہوگیا۔ بہت دیر کی ملازمت تھی۔ صاحب اس کو چاہتے تھے۔ انہوں نے مدن کو کمی پوری کرنے کیلئے صرف دو دن کی مہلت دی۔

کس طرح کیش سے تین ہزار روپے غائب ہوگئے۔ یہ بات سوچنے پر بھی مدن نہ سمجھ سکا۔ ایک دم پاگل کی طرح بھاگتا ہوا۔ وُہ رُوپا کی کوٹھڑی میں گھسا۔ رُوپا کے پاس جاکر کہنے لگا "غضب ہوگیا"۔ سب معاملہ سُن کر رُوپا کا چہرہ اُتر گیا۔ مدن نے کہا۔ "جلدی زیور نکالو"۔

رُوپا نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میں نے تو سب زیور لیلا کو دے دیئے ہیں"۔

مدن نے بچوں کی طرح پریشانی کی حالت میں رو کر بولا "تم نے اُسے کیوں دے دیئے؟ کیوں دیئے نہیں کس نے دینے کو کہا تھا؟"

رُوپا نے اُس کا ٹھیک جواب دے کر کہا "تو اس میں نقصان ہی کیا ہوا؟ وہ زیور کہیں پہلے تھوڑے گئے ہیں"؟

ڈرپوک مدن نے بھری آواز سے کہا "ہاں۔ اگر تم کوئی بہانہ کر کے اس سے زیور نکال لو۔ تو اچھی بات ہے۔ لیکن تمہیں میری قسم۔ اُس سے یہ نہ کہنا کہ مَیں زیور مانگ رہا ہوں"۔

تب رُوپا نے نفرت سے کہا "کیا یہی تمہارے بہانہ بازی کا وقت ہے۔ چلو"۔

یہ کہہ کر رُوپا خاوند کو ساتھ لے کر لیلا کے کمرے میں گئی۔ لیلا نے ایک بات نہ سُنی۔ ہر بات کا یہی ایک جواب دیا "میں کچھ نہیں کر سکتی"۔

دُنیا کی کوئی فکر اسے کرنی ہو گی۔ خاوند کی بُرائی۔ بھلائی پر دھیان دینا ہو گا۔ ایسا وعدہ تو اُس نے کبھی نہ کیا ہو گا۔ سب اپنی اپنی فکر کریں۔ اور لیلا کے آرام کا خیال رکھیں۔ ایسا ہی ہونا چاہئے۔

تب مدن لیلا کے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔ لیکن لیلا نے اس کے جواب میں صرف یہی کہا "یہ سب کچھ مَیں نہیں جانتی۔ مَیں اپنی چیز واپس نہیں کر سکتی"۔

مدن نے دیکھا۔ یہ دُبلی پتلی خوبصورت بیوی لوہے سے بھی

سخت ہے۔ مصیبت کے وقت خاوند کی ایسی کمزوری دیکھ کر رُوپا نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ اُس نے لیلا سے زبردستی چابیاں چھیننے کی کوشش کی۔ مگر چالاک لیلا نے چابیاں باہر تالاب میں پھینک دیں۔

رُوپا نے بے وقوف خاوند سے کہا "دیکھتے کیا ہو۔ تالا کیوں نہیں توڑ ڈالتے؟"

لیلا نے کہا "تو مَیں پھانسی لے لوں گی"۔

مدن نے کہا "رہنے دو۔ مَیں ایک اور طریقہ سے کیش پُورا کر دُوں گا"۔

وہ پاگلوں کی طرح باہر بھاگ گیا۔ دو گھنٹہ کے اندر اندر مدن نے اپنا جدّی مکان تین ہزار میں فروخت کر ڈالا۔

بہت مشکل سے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں ٹل گئیں۔ لیکن ملازمت سلامت نہ رہ سکی۔ اب تمام جائداد میں سے دو بیویاں رہ گئیں۔ اُن میں سے لیلا حاملہ ہو کر بالکل ہی چارپائی پر پڑ گئی۔ اب مدن نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔

لیلا کی بے صبری اور تکلیف بڑھ گئی۔ وُہ کسی طرح بھی یہ نہ سمجھنا چاہتی تھی۔ کہ اُس میں اپنے خاوند پر بھروسہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے۔

تو اُس نے شادی کیوں کی تھی؟

مکان کی بالائی منزل میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں لیلا اور مدن کی رہائش تھی اور دُوسرے میں رُوپا رہتی تھی۔ لیلا ہمیشہ یہی کہتی تھی "۔ اس گندے اور چھوٹے سے گھر میں رہ نہیں سکتی۔"

مدن جھوٹ ہی کہتا " گھبراؤ مت۔ مَیں جلدی ہی دُوسرا مکان بدل لُوں گا۔ تلاش کر رہا ہوں۔"

لیلا کہتی "کیوں یہ پاس ہی تو بڑا مکان ہے

لیلا جب پہلے مکان میں رہتی تھی تب اُس کے ہمسایہ عورتوں سے بات تو کیا کبھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مدن کی گری حالت دیکھ کر ایک روز محلے کی دو عورتیں لیلا کے پاس آئیں۔ مگر لیلا کمرے کا کواڑ بند کئے۔ اندر بیٹھی رہی۔ اور کسی حالت میں بھی کمرہ نہ کھولا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد اُس نے رو رو کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ اسی طرح کے جھگڑے روزانہ بڑھنے لگے۔ آخرکار لیلا کی صحت خراب ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کے حمل گرنے کا خطرہ ہو گیا۔

مدن نے ایک دن رُوپا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"تم ہی لیلا کو بچا سکتی ہو۔"

رُوپا۔ دن رات ایک کرکے اس کی تیمارداری کرنے لگی۔ کسی کام میں ذرا بھی دیر ہونے سے لیلا اس کو گالی دیتی۔ لیکن رُوپا خاموش رہ کر سب کچھ سُن لیتی تھی۔

لیلا کسی طرح بھی ساگودانہ کھانا نہ چاہتی تھی۔ برتن کے ساتھ ہی اسے پھینک دیتی۔ بُخار میں کھٹی چیزیں کھانے کی ضد کرتی۔ اور اگر نہ ملتی۔ تو رو کر اودھم مچا دیتی تھی۔ مگر روپا اُسے بچّوں کی طرح بہلاتی رہتی۔

ہزار کوشش کرنے پر بھی لیلا موت کے مُنہ سے بچ نہ سکی۔ مدن کی عزّت۔ محبّت کو لے کر وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔

مدن کو پہلے تو بڑا بھاری صدمہ ہُوا۔ مگر جب اُس نے سوچ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس روز کے جھگڑے سے تو ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا ہے۔ افسوس میں بھی اچانک اسے ایک طرح سے راحت مل گئی۔

اور اس کی رُوپا ——— ویسے ہی مستقبل کی طرح گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ اس کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے اور روپا کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ تھا۔

اُس دن آدھی رات گزرنے پر جب سارا شہر نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ مدن آہستہ آہستہ روپا کے کمرہ میں گیا۔ چُپ چاپ ایک پلنگ پر لیٹ رہا۔ لیکن اُسے اپنے پُرانے حق کو حاصل کرنے کیلئے چور کی طرح کمرہ میں گُھسنا پڑا۔

نہ تو روپا نے ہی کوئی بات کی اور نہ مدن ہی کچھ بولا۔ دونوں جیسے پہلے پاس ہی سوتے تھے۔ ویسے ہی آج بھی سوئے۔ لیکن دونوں کے دلوں میں ایک ہونے والے لڑکے کی یاد تھی۔ اِس کی رُوح اُن کے دِلوں کو تڑپا رہی تھی۔ دونوں کے دلوں میں ایک شعلۂ غم روشن تھا۔

خواہش

مَیں تیرے لئے گیت گانے کو یہاں حاضر ہُوں۔ تیرے اس مندر کے ایک کونے میں میری جگہ ہے۔

تیری دُنیا میں مجھے کوئی کام نہیں کرنا۔ میری اس زندگی سے کچھ تانیں کبھی کبھی بے مطلب نکل سکتی ہیں۔

نصف شب کے اندھیرے مندر میں جب تیری اُپاسنا کا گھنٹہ بجے تب مجھے گانے کے لئے اپنے مقابل کھڑے ہونے کی اجازت عنایت کرنا۔

صبح کی ہواہیں جب سُنہری بین کا ساز ملایا جاتا ہے۔ تب اپنی سیوا میں حاضر ہونے کی اجازت دے کر میری عزت کو دوبالا کرنا۔

شعلۂ چراغ

افسانہ نمبر ۲

مہمان

جب موت تمہارے دروازے کو کھٹکھٹائے گی۔ تب تم اُسے کیا نذر کرو گے؟

پیاسے میں اپنے مہمان کے آگے اپنی زندگی کا لبریز جام رکھ دوں گا۔ میں اُسے خالی ہاتھ کبھی نہ جانے دُونگا۔

جب آخری وقت میں موت میرے دروازے کو کھٹکھٹائیگی تو میں گرما کی شیریں پیداوار بسنت کی تمام راتوں کے پھل پھول اور اپنے شب و روز کے کام اور اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز یکجا کرکے اس کے آگے رکھ دونگا

شعلۂ چراغ

دو ہزار سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ مگدھ کے راجہ بیم سار نے مہاتما بدھ کی خدمت میں عرض گذاری۔ "کہ اگر حضرت کے مقدس پاؤں کا ایک ادنےٰ سا ذرہ ناخن حاصل ہو جائے۔ تو میں بے حد سکھی ہو جاؤں۔"

"اس ذرہ ناخن کو حاصل کر کے دنیا میں کس طرح کی قیامت لانا چاہتے ہو راجہ جی؟" مہاتما بدھ نے استفسار کیا۔

"میں ایک عمل۔ عدم تشدد اور راستی کے لیے روحانی تقویت کے لیے چاہتا ہوں۔" راجہ نے جواب دیا۔

شاہی باغیچہ کے ایک کنارے پریم سار نے مہاتما بدھ کے ذرہ ناخن کو گاڑ کر اس پر ایک خوبصورت ستون تعمیر کرایا۔ صناعوں نے ایک دلکش مصوری سے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سنگ مرمر کے بت ابھی بول اٹھیں گے۔ اپنے ہی حسن پر شیدا ہو کر محو رقص ہو جائیں گے۔ اس قدر دل آویز تھی۔ صناعوں کی کارگذاری۔

ہر روز گہری شام کے وقت راجہ اور شاہی دوشیزائیں غسل فرماتیں اور بعد میں مقدس کپڑے زیب تن کر کے پھولوں کی طشتری میں سامان پرستش لیکر جاتیں پھر سونے کے ایک بڑے طشترے میں دنیائے پرستش کر کے مقدس ستون کے قریب جاتی تھیں۔ ستون کے قریب تمام شب پھولوں کی ایک مالا جھک چھوڑ دیتی تھی۔ سونے کے ان چراغوں کی شعائیں جن سے آرتی کا کام لیا جاتا تھا علی الصبح تک نور افشاں رہتی تھیں۔ پرستش کے ان ہر دو اوقات میں نئے پھول لئے چراغ اور عبادت کے لئے ہر نیا ساز و سامان تیار کیا جاتا تھا۔ تاکہ اپنے دیوتا کی نظر عنایت سے فیض یابی حاصل کی جائے۔

مگر اب نئے مہاراجہ نے آتے ہی تباہی مچا دی۔ خون کی

ندیاں بہا کر اپنے باپ کے دھرم کا قبضہ کر دیا۔ اور بدھ دھرم کے شاستروں کو یگ کی لہلاتی ہوئی آتشین آتش میں ڈال دیا گیا۔ سلطنت بھر میں منادی کرا دی گئی۔ پرستش کرانے کے لئے یہ تین مخصوص چیزیں ہی وقف ہیں۔

وید۔ براہمن اور راجہ۔

اور جو کوئی کسی چوتھی چیز کی پرستش کرے گا۔ تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

اہل سلطنت کانپ اٹھے۔ بدھ کے نام تک کی رٹا رٹ بند ہو گئی جگہ بجگہ ویدوں کے یگ کی آتشیں آہوتی تباہی تباہی کرتی ہوئیں فلک بوس ہونے لگیں۔

ایک روز شام کا واقعہ ہے۔ ایک شاہی دوشیزہ تبلیغ مقدسہ کی مخصوص حسینہ غسل لے کر تیاری کر رہی تھی۔ پھول اور دیئے بھی تیار کر لئے گئے تھے۔ شاہی دوشیزہ کے لبوں پر مہاتما بدھ کا نام تھا۔ جو ترنم کی صدا کو لئے فضائے لطیف میں گونج رہا تھا۔

یہ عورت کون ہے ؟ کیا اسے راجہ کا خوف نہیں ہے۔ کیا اسے شاہی منادی کا علم نہیں ہے ؟

اس کا نام ہے شترمنی۔ اور یہ ایک شاہی کنیز ہے۔ جن کا کام

ہے۔ شاہی تبلیغ کی خدمت گذار ہی سرد زجب شاہی خاندان کی مہارانیاں عبادت کے لیے جاتی تھیں۔ تب شریمتی بھی جو کہ علم سے بے بہرہ اور گنوار دوشیزہ تھی۔ شاہی مہارانیوں کے ساتھ عبادت کی نقل کیا کرتی تھی۔ ان کے ہمراہ مقامِ مقدسہ پر جاکر یہ گنوار دوشیزہ ایک کنارے کی طرف کھڑی ہو جاتی۔ بیشک اُسے کچھ نہیں آتا تھا۔ تو بھی آنکھیں موند کر وہ کچھ نہ کچھ رٹا کرتی تھی۔ جیسے کہ اس کی باتوں کو کوئی اندر ہی اندر سے سُن رہا ہو۔

اُس نے شاہی منادی سنی تھی۔ سامانِ پرستش لے کر، یہ گنوار دوشیزہ راج ماتا کے پاس آکر کہنے لگی۔" ماتا وقت عبادت ہے۔"

مہارانی۔ راج ماتا کا جسم تھرتھرا اٹھا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے کہا نادان! جانتی نہیں ؟ ـــــ ستون پر دھوپ دیپ رکھنے والے کو پھانسی ملے گی۔ یا کالا پانی ہو گا۔ اے بیوقوف داسی بھاگ جا بھاگ جا۔ اب سے عبادت کا نام بھی نہ لینا۔ جا بھاگ یہاں سے۔

وہاں سے لوٹ کر گنوار دوشیزہ راج رانی شری رمتادیوی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قدآدم آئینہ جیسی ہیرے جواہرات آویزاں تھے۔ اور جن کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ٹھیک اس آئینہ کے مقابل کھڑی ہو کر راج رانی سنورنے میں مصروف تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں سنے

اپنے بالوں کی چیری میں مانگ بھر رہی تھی۔ سندھور سے موتی ڈال رہی تھی۔

گنوار دوشیزہ کے ہاتھوں دنیائے زیبائش دیکھ کر راج رانی چونک اٹھی، ہاتھ ہل جانے سے اس کی مانگ ٹیڑھی ہوگئی۔ داسی نے کہا۔" رانی جی وقتِ عبادت ہے۔"

رانی نے کہا۔" اس کے ساتھ وقت اجل بھی۔ نکل جا یہاں سے کوئی دیکھ لے گا۔ تو راجہ جی کا غصہ جاگ اٹھے گا۔ عبادت کے روز تو چلے گئے۔"

راج محل کی کھڑکی سے نکل کر افق کی آڑ میں جلتے ہوئے آفتاب کو گھورتی ہوئی راجکماری شاندتلا نظموں کی ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ جھانجھ کی جھنکار سن کر اس نے دروازے کی طرف نگاہ کی تو دیکھا۔ گنوار دوشیزہ شرمیتی شاہی کنیز کھڑی ہے۔

"راجکماری۔ چلو عبادت کے لئے چلو۔"

"تو ہی جا مرنے کے لئے۔" شکنتلا بولی۔

شہر کے دروازے پر جاکر شرمیتی گنوار دوشیزہ نے پکار لگائی شہر میں بسنے والو بھگوان کی عبادت کا وقت ہوگیا۔ چلو۔ کیا کوئی نہیں چلے گا؟ کیا راجہ جی کا خوف اس قدر دامنگیر ہے۔ کیا جان

اس قدر زیادہ عزیز ہے۔
کسی نے بھی اس کی بات پر دھیان نہ دیا ——— اور کوئی بھی جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ہر ایک کو خطرہ تھا۔ دوشیزہ ایک گہری شام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بیٹی شریمتی دیر نہ کرو۔ اور حسینہ کا منہ کسی روحانی جلوے سے چمک اٹھا۔ وہ ستون کی طرف بڑھی۔
دن کی آخری روشنی تاریکی میں جذب ہونے لگی تھی۔ اور اب ہر طرف اندھیرا سا ہو گیا۔ لوگوں کا ہجوم بازاروں میں کچھ کم ہو گیا تھا۔ یکایک سلطنت کے شاہی مقام جہاں ہر روز چراغ جلائے جاتے تھے۔ ٹھیک اسی جگہ سے کوئی دیئے روشن کرنے میں مشغول تھا۔ رات ہو گئی۔ شدت کی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس مقام پر شمعیں جگ اٹھیں۔ شاہی دربان نے مہاراج کے حکم کے مطابق اس کے نزدیک جا کر اونچی آواز میں کہا "عبادت ختم کرو۔"
اسی وقت نقارے پر چوٹ لگی۔ اہل سلطنت یکبارگی کیوں متوجہ کئے گئے۔ تمام پہرے دار ستون کے قریب آئے۔ یہ چور خونی یا کوئی بھوت نہیں تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہی باغیچے کے درمیان

میں گہری تاریکی کے بیچ اس مقدس ستون کے قریب کوئی دیپ بالا
روشن کرنے میں مصروف ہے۔
ننگی شمشیریں لیے کر شہر کے محافظ بھاگے آئے۔ ستون کے قریب
آکر دیکھتے ہیں۔ کہ ایک عورت ستون کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی
ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ اور عبادت کرتے ہوئے اس
کے لبوں پر مسکراہٹ سی ناچ رہی ہے۔
شہر کے بڑے محافظ نے اس خود کھوئے جسم کو خوب جھنجوڑا
اور کہا "موت کو پیشانی پر اٹھا کر اس جگہ آرتی کرنے والی او بد نصیب
تو کون ہے؟"
"میرا نام ہے شری پتی۔ میں ہوں بھگوان کی مقدس خدمت
گذار داسی"
ننگی شمشیر اس گنوار سادہ لوح حسین دوشیزہ کی گردن پر
پل پڑی۔ مقدس ستون کے قریب کی وہ سرزمین اس دن اس کے
خون سے سرخ ہوکر اور بھی زیادہ مقدس ہو گئی۔
موسم سرما کی اس تاریک اور گہری غیر آباد شب کے سنسان
ماحول میں۔ شاہی باغیچہ کے ایک گوشہ میں عالم تنہائی میں کھڑے
صرف اس مقدس ستون کے قدموں میں آرتی کے چراغ کا وہ

آخری چراغ بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن اس پرستارہ۔ اس عابدہ کے اندرونی چراغ کا شعلہ تو عرصہ لامحدود تک بھی۔ خاموش رہ کر سمجھنے کے قابل نہیں۔

شعلۂ اجل

افسانہ نمبر

تحفہ الفت

اے پاگل! اپنے ہی کندھوں پر خود ہی چڑھنے کی کوشش
اے بھکاری! اپنے ہی دروازے پر خیرات مانگنا۔

اپنے تمام بوجھ اس کے ہاتھوں پر چھوڑ دے۔ جو سب اُٹھا سکتا ہے۔ اور تکلیف میں پیچھے کبھی نہیں دیکھتا۔

جس چراغ کو تیری خواہش چھکتی ہے۔ اس کی روشنی کو یک دم گُل کر دیتی ہے۔ وہ ناپاک ہے۔ اس کے ناپاک ہاتھوں سے کوئی چیز مت لینا۔ صرف اسی کو منظور کرنا۔ جو چیز محبت سے دستیاب ہو۔

شعلہ اجل

نریش اپنے ہم عمر لڑکوں میں سردار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی پارٹی کا ہر ممبر اس کے ہر جائز و ناجائز حکم پر جان قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ نریش کا دماغ شیطان کا کارخانہ تھا۔ اس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت ہی ظہور پذیر ہوتی رہتی تھی۔ حسب معمول وہ اور اس کے ساتھی سمندر کے کنارے کھیل کود میں مست تھے۔ لب ساحل ایک بہت بڑا لکڑی کا شہتیر پڑا ہوا تھا۔ تمام لڑکے اس کے گرد جمع تھے۔ اور آپس میں پکڑنے کے کھیل میں مشغول تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ میں اپنے مخالف کو پکڑ لوں ...

یکایک جوش نے نریش کی زبان پر آکر سب کو حکم دیا۔ "میرے پیارے بھائیو! آؤ ہم سب مل کر اس شہتیر کو جو کہ زمین کی چھاتی پر بڑا بھاری بوجھ پڑا ہے۔ جس کی درد سے ریت بھی رو رہی ہے۔ اس کو پانی میں بہا دیں۔ اور جب اس کا مالک آئے۔ وہ دیکھ کر زہریلے سانپ کی طرح زہر اگلے۔ اور دیوانوں کی طرح، پاگلوں کی طرح چیخ و پکار کرے اور ہم سب اس کی پھبتی اڑائیں۔ اس کا مخول اڑائیں۔"

اس حکم کے پاتے ہی ہر ایک کے دل و دماغ میں مسرت کی ایک لہر موجزن ہو گئی۔ اور سب نے مل کر قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ سب نے خوشی ظاہر کی۔ غرضیکہ چند منٹوں میں بہادر سپاہیوں کی طرح مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔

یکے بعد دیگرے سب شہد کی مکھیوں کی طرح اس شہتیر کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ کہ اتنے میں نریش کا بھائی ——— یوگندر جو شرافت کا ایک حقیقی مجسمہ تھا۔ بجلی کی طرح نمودار ہوا۔ اس کی رگ رگ میں شرافت، عقلمندی اور حلیمیت جھلکتی تھی۔ اور اس کے برعکس نریش دوسرا شیطان تھا۔ اس کی رگ رگ میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یوگندر نے بارعب نظر سے لڑکوں کو دیکھا

ان کے حواس خطا ہو گئے۔ اب کانو تو ان کے بدن میں لہو کا نام و نشان بھی نہیں سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اور ان کے بازوؤں نے جواب دے دیا۔ اب کریں تو کیا کریں۔ آخر لاچار ہو کر لڑکوں کو بغیر تکلیف دئے جھٹ پٹ اس شہتیر پہ بیٹھ گئے۔

پھر ایک دو نے مل کر یوگندر کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کے لئے اور خود کو کامیاب بنانے کے لئے محبت سے کہا۔ پھر سختی سے جب پھر بھی مقصد میں پورے نہ اترے۔ تو تنگ آکر اس کو دھکا دیا۔ مگر یوگندر ایک بڑے بھاری پہاڑ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا۔ بلکہ اس نے اپنے آپ کو اور بھی مضبوط بنا لیا۔ اس حالت کو دیکھ کر نرلیش کی آنکھیں خون کتو بر ہو گئیں۔ کرودھ دیوتا نے اپنا پورا جلال دکھایا اور ایک بھاری اجگر کی طرح پھنکاریں مارتے ہوئے کہا۔

"یوگندر۔ تم ہمیشہ ہر ایک کام میں روڑا اٹکایا کرتے ہو میں تمہارے اس سودا سے بہت تنگ آگیا ہوں۔ اس لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا ـــــ مجھے تمہارے ساتھ زبردستی کرنی پڑے گی۔"

یوگندر کے بدن پر جوں تک نہ رینگی۔ بلکہ مقابلتاً وہ اپنے آپ کو

اور زیادہ ہوشیار کرنے لگا۔ نریش نے اپنے چھوٹے بھائی کو اور زیادہ ہوشیار دیکھا۔ تو اس کے چہرے پر زردی چھا گئی...... ساون بھادوں کے آسمان کی طرح اس کے چہرے کی حالت ہونے لگی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ "قہر درویش بر جان درویش" خون جگر پینے لگا۔ اس کے ہاتھوں نے یوگندر کو سزا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پاؤں نے زمین کو چھوڑنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اب نریش کو ناچار دوسرا سخت حکم ہی دینا پڑا۔ اور کہا "اگر نہیں اٹھتا۔ تو شہتیر کو اس کے ساتھ ہی پانی میں دھکیل دو۔"

تمام لڑکیوں نے سر تسلیم خم کیا۔ اور مل کر اس شہتیر کو پانی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

یوگندر کی آنکھیں خون کبوتر ہو گئیں۔ اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ خبردار اگر کسی نے لکڑی کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔ مگر نریش کے دوسرے حکم نے سب لڑکوں کو پھر تازہ دم کر دیا سب نے مل کر آخر لکڑی کو دھکیل ہی دیا۔ یوگندر رونے منہ زمین پر آ رہا۔ اُسے سخت چوٹ آئی۔ سر پھٹ گیا۔ مگر نہ ہی نریش کو اور نہ ہی اُس کے ساتھیوں کو کسی قسم کا فکر تھا۔ یوگندر نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ نریش جیسے منہوں

الاغر مریض ہوتا ہے۔ زمین پاؤں سے نکل گئی۔ خوشی غمی میں تبدیل
وگئی۔ سامانِ حیات کو برباد کرنے کے بعد غمگین انسان کی طرح
ریش بھی افسردگی کی حالت میں تھا۔ اور آئندہ باتوں کے لئے سوچ
لے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ کہ اس کو دنیا و ما فیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔
۔ اتنے میں یوگندر بھوکے شیر کی طرح اٹھا۔ آنسوؤں کا دریا بہتا
ہوا۔ سمندر کی بے قرار لہروں کی طرح تھا۔ اور بجلی کی طرح چمکتا
ہوا۔ آنِ واحد میں نریش پر جا گرا۔ اس کو زخمی کر ڈالا۔ وہ بیچارہ
مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ مگر یوگندر ــــ جو کہ ایک فدائی کا
تھا کا جوش جنون کم نہ ہوا۔ گرے ہوئے بھائی پر کالوں کی
ردی۔ جب ذرا شناختی کی جھلک نمودار ہوئی۔ غصے کو شکست دیا
ہوا۔ آٹھ آٹھ آنسو روتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہوا۔

نریش۔ غم خزاں رسیدہ بلبل کی طرح اپنی شومئی قسمت پر نالہ کر رہا تھا
س کو یہ بھی خبر نہ تھی۔ کہ وہ کس دنیا میں۔ کس جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہاتھوں کی
نگلیوں نے تنکوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ جس نے اس کے شیطانی دماغ
یں فلاسفی بھرنی شروع کر دی۔ اور اس کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ گویا
س کو اس کی قسمت سے کہیں۔ سینکڑوں کوس کی مسافت پہ لیے جا رہا
جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک آنے والی کشتی نے اس کی خیالی دنیا کو درہم

برہم کردیا۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہی اس کے جذبوں کو بہادیا۔ کشتی رُکی۔ تواس میں ایک آدمی جس کے سر کے بال بھورے رنگ۔ مگر داڑھی اور مونچھیں سیاہ تھیں۔ زمین پر سرد کے درخت کی مانند کھڑا ہوگیا۔

"بیٹا چکر ورتی خاندان کی جاگیر رہائش کہاں ہے"۔ اس ادھیڑ عمر انسان نے نریش کو کہا۔ اب نریش نے بجائے جواب دینے کے سرد آہ بھری۔ اور چپ رہا۔ اجنبی نے دوبارہ۔ سہ بارہ دریافت کیا۔ اور لالچ بھی دیا۔ مگر نریش۔ زندگی سے بے قرار نریش ہر بار ادھورہ سا جواب دے دیتا۔ غرضیکہ اجنبی کو اپنا سا منہ لے جانا پڑا۔ اجنبی دِل ہی دِل میں اُس کی زندگی پر نفرت کا اظہار کرنے لگا۔ اِسی اثنا میں گھر سے ایک ملازم باہر نکلا ۔ اور نریش کو اس کی ماتا کا پیغام دیا۔ کہ جس حالت میں ہو۔ فوراً گھر پہنچ جاؤ۔ مگر نریش اپنی ہی دنیا میں رہنا چاہتا تھا۔ اُس کو گھر جانا کسی بھی طرح منظور نہ تھا۔ خوف تھا۔ جس کی وجہ سے اُس نے گھر جانے سے بالکل کورا جواب دے دیا۔ مگر با وجود انکار کرنے کے اسے زبردستی پکڑ کر گھر کو لے چلا۔ نریش نے ہر چند کوشش کی۔ کہ اس کے فولادی پنجوں سے کسی نہ کسی طرح رہائی پا جاؤں۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔

"نریش۔ تم نے آج پھر لوگندر کو مارا ہے۔ آؤ! آج میں تمہاری دُرگت بناتی ہوں"۔ ماں نے کہا۔

"ماتا! میں ایشور کو گواہ دیتا ہوں۔ کہ میں نے آج یوگندر کو بالکل نہیں مارا۔ بلکہ" اس لفظ کے اس کی آنکھوں نے ایک اتھاہ ندی بہادی۔

"اب یہ رو دھو کر سچا بننا چاہتا ہے۔ ماتا جی! اس نے ہی مجھے مارا ہے"۔ یوگندر نے بارُعب آواز میں کہا۔

نرلیش جو اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ برداشت کی حد ہو گئی۔ اب وہی نریش جس پر کرودھ کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک خونی شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ اور یوگندر پر مکوں کی ایک بہت بھاری بارش شروع کر دی۔ جس سے وہ بیہوش ہونے لگا۔ مگر نریش یہی کہتا تھا۔ کہ "پہلے نہیں۔ اب مارتا ہوں۔ اچھا! یہ جھوٹ بولنے کا پھل ہے۔ جتنا تم سے ڈرتا ہوں۔ اتنا ہی تو سر چڑھتا ہے"۔

ماں بچے کی یہ حالت نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے نریش پر حملہ کر دیا۔ اور اب اس کو دیسی مار پڑنے لگی۔ مگر نریش نے اپنی سابقہ عادت کو بدل دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ یوگندر کو چھوڑ ماتا کی طرف ہو گیا۔ ماں ایسی حالت دیکھ سخت حیران ہوئی اور بچوں کی طرح زارو قطار رونے لگی۔

اسی اثناء میں وہ بھورے رنگ کے بالوں والا اجنبی اندر آیا۔ اور حیرانگی کی حالت میں کہنے لگا "یہ کیا" جب نریش نے اس اجنبی کو دیکھا تو ایسا شرمندہ ہوا۔ کہ کاش اس کو زمین جگہ دیتی تو اس میں سما جاتا۔ وہ دل ہی دل میں دُعائیں مانگنے لگا۔ کہ یا خُدا اب مَیں نہ رہوں۔ اپنی قہر آلودہ بجلی کو میرے خرمن ہستی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے بھیجدو۔ یا ملک الموت کے فرشتے کو بھیج دو۔ لیکن اُدھر اُس کی ماں نے اپنے دیور کو پہچان لیا۔ جھٹ پٹ اپنے آپ کو درست کیا۔ افسوس کی بجائے خوش۔ بہت خوش ہو گئی۔ اور کہا۔" آیا۔ میں قربان جاؤں۔ جو تم نے درشن دیئے۔ آج بہت ہی اچھا دن ہے۔ جو آپ نے آنے کی تکلیف گوارہ کی۔ بیٹھ جائیے۔

اس کے دیور ترلوک نے نہایت عزت سے اپنی بھاوجہ کے چرنوں میں سیس جھکایا۔ اور بھائی کی ناگہاں موت پر زار زار آنسو بہانے لگا۔ اب دونوں طرف سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس کی تھوڑی دیر اور بچوں کے نالہ نے بھی نالمل کا کام دیا۔ جب ذرا فراغت پائی۔ تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں

ایک روز ترلوک ناتھ نے اپنی بھاوجہ سے دریافت کیا۔ "نریش اور یوگندر کی کیسے گذرتی ہے" نریش دوسرا شیطان

اس کی رگ رگ میں شرارت ٹپکتی ہے۔ گستاخ بدست الوجود ہے
مگر اس کے برعکس یوگندر ایک دیوتا ہے۔ شرافت کا جذبہ اس کو
وراثت میں ملا ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کروں۔ اتنی ہی تھوڑی
ہے۔" اس کی بھاوجہ نے سرد آہ بھر کر کہا یہ بات سن کر توترلوک
کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور محبت آمیز لہجہ میں پرارتھنا کرنے لگا
"اگر آپ برا محسوس نہ کریں۔ تو میں نریش کو ساتھ لے جاؤں۔ اور
وہاں پر اپنے لڑکوں کیساتھ اس کو تعلیم دلاؤں۔ ان کی صحبت سے
یہ بہت اچھا ہو جائے گا۔ اس کی بھاوجہ کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔
ایک بڑا بھاری بوجھ سر سے اٹھنے والا تھا۔ اس کی مراد بر آئی۔ اب
نریش سے پوچھنے لگی۔" نریش۔ تم نے اپنے چچا جان کی باتیں سن لیں ہیں
اور کہوں۔ ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس سے سب خوش و خرم رہیں گے۔"
"ماتا جی۔ میں کب انکار کر سکتا ہوں۔ میں بہت ہی خوش ہوں۔ کہ ان کے
ساتھ چلا جاؤں۔ ضرور جاؤں گا ماتا جی" ضرور جاؤں گا۔" نریش نے
خوشی خوشی کہا۔

یوگندر اداس اب خوش خوش رہنے لگے۔ گویا اس کی مصیبتوں
کا اب خاتمہ ہو گیا ہے۔ دنیا بھر کی تمام خوشی اسی کے لیئے وقف
کر دی گئی ہے۔ مگر کبھی کبھی بیٹے کے جدا ہونے کے غم سے اس کو

بہت بے چینی ہوتی ..... جس سے وہ تڑپنے لگتی مگر تھوڑی دیر کے بعد سوچ کے پانی سے اُس پنس کو بجاتی۔ جس سے اُسی کے دل کو شانتی نصیب ہوتی۔

اب نریش کو اٹھتے بیٹھتے۔ کھاتے۔ پیتے غرضیکہ ہر گھڑی یہی فکر دامنگیر تھی۔ کہ وہ کونسی مبارک ساعت ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو کلکتہ میں پائے گا۔ ہر وقت اسی میں رہتا اسی دوران میں اُس نے اپنی تمام یونہی ــ شغل کے سامان ــــ سب کچھ اپنے چھوٹے بھائی یوگندر کو دے دیئے۔ اب دونوں میں چکور اور چاند جیسی محبت پیدا ہوگئی۔

کلکتہ پہنچتے ہی پہنچتے وہ خوشی کے سمندر میں کئی بار غسل کرتا رہا۔ آئندہ سرسبز باغ میں سیر و تفریح کا سامان بناتا رہا۔ مگر اس وقت جب کہ وہ اپنی چچی جان کے سامنے ہوا۔ تو اُس کی خوشی کافور ہوگئی۔ رنج و غم کے بادل چھا گئے۔ اُس کا گلاب جیسا چہرہ مرجھا گیا۔ کیونکہ اس کی چچی اس کے آنے سے بہت دغیسرہ ہوگئی..... اس کی ناک بھوں کو دیکھ کر نریش کے سینے پر ایک چھری چل گئی:ــ

نریش دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ ہر وقت اسی خلش میں مبتلا رہتا۔ کہ میں کیوں چچی جان کے لیئے بوجھ بن رہا ہوں۔

آہ خواہ مخواہ ایک مہمان بن کر اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہوں
مگر جس وقت پچی جان کا کسی کام کرنے کا حکم پاتا۔ تو اُس کا ننھا سا
دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ مگر تھوڑی
دیر کے بعد پھر چچی صاحبہ غم و غصہ میں مبتلا ہو جاتیں۔ اور طرح
طرح کے شک آمیز لفظوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ تو اِس کے زخمی
دل پر نمک پاشی کا کام دیتا۔

تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ کہ نرلش نے اپنے آپ میں ایک
فاعِل کمزوری پائی۔ اب اُس کا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ یہاں
سے بھاگ کر کسی کھلے میدان میں چلا جاؤں۔ اور اُس کی
تازہ ہوا سے اپنے بے قرار دل کو سکون دوں۔ مگر میدان
اور اُس کی کھلی ہوا۔ خواب و خیال میں بھی ملنے کا امکان نہ تھا۔
کیونکہ یہاں پر تو سوائے فلک بوس عمارتوں کے اس کی نظر میں
کوئی نہ آتا تھا۔ جس طرف نگاہ کرتا۔ دیواروں سے ٹکر کھا کر واپس آجاتی
تھی۔ مگر کبھی کبھی اس کو رات کے وقت خواب میں اپنا بچپن کا وقت
یاد آجاتا۔ تو اسے یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ——— جو کچھ دیوار
سب خواب تھا۔ جو سنا تھا۔ افسانہ تھا۔

نرلیش۔ دیہاتی نرلیش اپنے آپ کو شہری لڑکوں کے آگے اپنی

کوئی وقعت نہ پاتا۔ اس کے مقابل تمام ہوشیار اور لایق تھے پھر
بھی تھا۔ جو سب کی نظروں میں گرا ہوا تھا۔ ماسٹر بھی بڑی بے رحمی سے
مارتے تھے۔ لڑکے طعنے پہ طعنہ دیتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ یہ
قسمت کا مارا نالہ وگریاں رہتا تھا۔ اور اپنی شومئی تقدیر پر گلہ کرتا تھا۔
رات کو بیٹھے ہوئے نریش نے ہمت سے . . . . دل کو کڑا
کر کے کہا ۔" چاچا جی ۔میرا دل یہاں اُداس رہتا ہے۔
" ماہِ اکتوبر میں تم کو رخصتیں ہونے والی ہیں چند دن ٹھہر جاؤ۔"
اس کے چچا نے جواب دیا ۔ نریش نے ایک آہ سرد بھری اور رات
کی خاموشی میں خاموش ہو گیا۔
ایک دن کسی لڑکے نے نریش کو تنگ کرنے کی خاطر اسکی کتاب
کو چرا لیا ۔اب اس بے چارے کے لئے اور مصیبت کا سامنا کرنا
پڑا ۔ جس حال میں کتاب موجود ہوتی تھی ۔ تو وُہ پھر بھی سبق یاد نہ
کرتا تھا ۔ مگر اب کتاب بھی ندارد ۔ تو پھر اس کے لئے سبق کا یاد
کرنا بالکل غیر ممکن سا ہو گیا ۔اب اس کو سکول میں مار بہت پڑنے
لگی ۔ کہ اس کی مجرمانہ حالت پر سب کو رحم اور ترس آجاتا۔ مگر
بعد ازاں سب لڑکے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے اور اتنا
رولاتے ۔ستاتے کہ اس کے چچا زاد بھائی بھی دُوسروں کے ہم خیال

ہو جاتے۔ پھر نریش ایک ــــــ باقی ہزار والا معاملہ ہو جاتا۔ نریش دیوانہ۔ پاگل ہو گیا۔ ہر وقت رونے دھونے میں گذرتی۔ آخر کار مایوسانہ انداز میں اپنی بے بسی چچی صاحبہ پر ظاہر کر دی۔ چچی صاحبہ سُن کر بھُو کی شیرنی کی طرح گرجنے لگی۔ اتنے میں اس کی اولاد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جس سے اس نے نریش کو خوب مارا اور کڑک کر کہا۔

"بے حیا۔ بے شرم۔ بے وقوف لڑکے تو اتنا لاپرواہ ہو گیا ہے۔ کہ تجھے اپنی کتابوں کی خبر نہیں ہے۔ جاؤ اپنی ڈاین ماں کو کہو۔ کہ وہ تم کو کتابیں لے دے۔ میرے پاس تمہارے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میرا اپنا خرچ زیادہ ہے۔ وہ ہی پورا نہیں ہوتا۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

اس رات کو نریش نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اسی طرح بستر پر دراز ہو گیا۔ غمی کے بادلوں نے گھیر کر اس کو ملیریا بخار کی گود میں دے دیا سر پر چکّروں کا بھوت سوار ہو گیا۔ جس سے سر دماغ سب جسم چور چور ہونے لگا۔ یہاں اس کا کون تھا۔ جو اس کی مدد کرتا۔ اس کی وہاں پر ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کا ایک منٹ کا پھرنا بھی چچی جان کے لئے قیامت برپا کر دینے والا تھا۔ اس کی لگاتار دعاؤں کا آج نریش پر پورا اثر ہو چکا تھا۔ اس کو اپنے بدن کی بھی ہوش نہ تھی۔

جب کبھی ہوش آتی ۔ تو اپنے آپ کو درد سے بے قرار پاتا ۔ اور اُٹھ اُٹھ کر چچی جان کے آگے ہاتھ ہاتھ جوڑتا ۔ کہ اس دفعہ معاف کر دو پھر ایسی غلطی نہ کروں گا ۔ خدا کے لئے مُعاف کر دو چچی جان ۔ اگر تم مجھ کو مُعاف کر دو گی ۔ تو میرا پاک خُدا تمہارے گُنا ہوں کو معاف کر دے گا ۔ اور پھر مایوسانہ حالت میں بچّوں کی طرح رونے لگتا ۔ خیر اسی طرح رات گذر گئی ۔

صُبح ہوئی ۔ ضروری حاجات سے فارغ ہو کر ترلوک ناتھ دستر خوان پر آگیا ۔ نریش کو کھانے کی میز پر سے گم پاکر اس کے دل میں کانٹا سا چُبھ گیا ۔ اپنی بیوی سے اس کی غیر حاضری کی وجہ پُوچھی ۔ اس نے بہت بُرا بھلا کہا ۔ آخر ترلوک ناتھ خود ہی بے قراری کی حالت میں اُٹھا ۔ اس کی تلاش کی ۔ بصد مشکل اس کو بستر سے پر مدہوش پایا ۔ ترلوک ناتھ نے اس کا ہاتھ دیکھا تو گھبرا گیا ۔ کیونکہ اس پر بخار کا شدید حملہ ہو گیا تھا ۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا تھا ۔ تمام جسم پر لرزہ طاری ہو گیا ۔ اتنے میں نریش نے آنکھیں کھولیں ۔ تو اس کی جان میں جان آئی ۔ "نریش بیٹا اُٹھو" ترلوک نے رس بھری آواز میں کہا ۔

"چچی جی نہ مارو ۔ اب کی دفعہ مُعاف کر دو ۔ دیکھو ۔ ہاتھ جوڑتا

ہوں !" یہ کہہ کر نرلیش دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ نبض ساکن ہو گئی۔ ترلوک کو جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے دیکھ کر دوائی دی۔ جس سے کسی قدر بخار ہلکا ہوا۔ مگر پھر بھی جب نرلیش کو ہوش آئی۔ یہی پکارتا ——— "مَیں جاتا ہوں۔ اب نہ مارو۔ خدا کے لئے نہ مارو۔"

دوسرے دن نرلیش کی صحت کچھ قدرے اچھی ہو گئی۔ مگر اس کی آنکھیں کسی شئے کو ڈھونڈنے لگیں۔ جب اس کو نہ پاتیں تو سرد آہوں کی رفتار جاری ہوتی تو آنکھوں سے ایک دریا بہنے لگتا۔ مگر آج چُپ چاپ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ترلوک ناتھ اندر ہی اندر گھُل رہا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کے آگے منتیں مان رہا تھا۔ ایشور اور بھگوان سے اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ وہاں گیا تھا۔ سوائے مایوسی نے کچھ نہ تھا۔ آخر کار تنگ آکر اس کے کان میں کہا۔ "مَیں نے تمہاری والدہ اور بھائی یوگندر کو بُلا بھیجا ہے وہ بہت جلد آنے والے ہیں۔"

سورج غروب ہوا۔ شام ہوئی۔ ڈاکٹر کی انتظار ختم ہوئی۔ ڈاکٹر نے مریض کو دیکھتے ہی حسرت بھری آواز میں کہا کہ ایشور رحم کرے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ شاید رات تک ———

نریش اونچی آواز سے بکواس کرنے لگا۔ وُہ دیکھو ... وہ دیکھو
---- سامنے ---- ہائے ---- ہائے ---- تین چار ---- بچاؤ
---- بچاؤ ---- خُدا کے لئے بچاؤ ----"

اتنے میں اس کی ماتا اور اس کا چھوٹا بھائی یوگندر آ گئے انہوں نے نریش کی حالت دیکھی۔ تو ان کی آنکھوں میں ایک سیلاب اُمڈ پڑا۔ ترلوک ناتھ نے ہر چند حوصلہ دیا۔ مگر بے سُود۔ آخر کار اس کی ماں نریش کی چارپائی پر گر پڑی۔ جس سے اس کی آنکھیں کھُل گئیں اور ماں کو دیکھ کر اس کے سینے سے چمٹ گیا۔

"نریش۔ میرے پیارے بچے نریش۔ میری زندگی کا سرمایہ نریش اس کی ماتا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"کیا!" نریش نے زور سے پکڑ کر کہا۔

"میرے پیارے بچے نریش! اب میں آگئی ہوں تم اب اچھے ہو جاؤ گے"۔ اس کی ماں نے حوصلہ سے کہا۔

"نہیں ماتا۔ میں اب اس دُنیا میں نہیں رہونگا۔ بلکہ وہاں جاؤنگا۔ جہانکہ میرا باپ گیا ہوا ہے۔ میں اسکی گود میں باقیماندہ زندگی بسر کرونگا۔ اتنے میں اس کی حالت یکدم بگڑ گئی۔ زبان بند ہو گئی۔ اور شعلۂ اجل نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شعلۂ رُخ

افسانہ نمبر ۹

تیرے دروازے تک

تجھ سے ملنے کے لئے مَیں اکیلا نکلا تھا ۔ مگر یہ کون ہے ۔ جو اس ظلمت میں میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے ؟

اُس سے بچنے کے لئے میں اِدھر اُدھر ہٹ جاتا ہوں ۔ مگر مَیں اس سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا ۔

وہ اپنی تیز اور بھاری چال سے زمین کی دُھول اُڑاتا ہے ۔ وہ میری ہر آواز کے ساتھ زور سے بول اُٹھتا ہے ۔

وہ میری ہی حقیر آتما ہے ۔ میرے پربھو! شرم تو اس کے نزدیک تک بھی نہیں آئی ۔ مگر مجھے اُس کے ساتھ تمہارے دروازے پر آنے میں شرم محسوس ہوتی ہے



شعلۂ رخ

کئی حالتوں سے گزرنے کے بعد اُدھیڑ عمر لیلا نے جس آدمی کا سہارا لیا تھا۔ وہ بھی جب اسے پھٹے کپڑے کی طرح چھوڑ گیا۔ تب مٹھی بھر اناج ڈھونڈنے کے لئے کوئی دوسرا گھر تلاش کرنے میں اُسے بہت نفرت ہوتی۔

جوانی کی آخری سیڑھی پر موسم بہار کی طرح بہت ہی خوبصورت عمر آتی ہے۔ جب زندگی کا پھل پھلنے اور فصل پکنے لگتی ہے۔ اسوقت بسنت کی طرح بھری جوانی کی شوخیاں نہیں بھاتیں۔ اتنے دنوں میں گھریلو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ بُرائی۔ بھلائی۔ سُکھ۔ دُکھ زندگی میں

حصّے کر ضمیر کو عجب حالت میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس وقت کسی نئے آدمی کو اپنے پرست کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ بلکہ پرانا ساتھی ہی اچھا معلوم پڑتا ہے۔

لیلا نے اپنی جوانی کی شب میں ایک دن صبح ہی اٹھ کر دیکھا کہ اس کا دوست رات کو اس کا تمام زیور۔ روپیہ اٹھا کر لے گیا ہے۔ مکان کا کرایہ ادا کرنے کو بھی ایک پیسہ موجود نہیں۔ دو برس کے بچے کو دودھ پلانے کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب لیلا نے سوچ کر دیکھا۔ کہ اپنی چالیس برس کی عمر میں وہ ایک آدمی کو اپنا نہ بنا سکی۔ ایک گھر کے کونے میں بھی۔ مرنے جینے کو بھی ٹھکانہ نہ کر سکی۔ جب اسے معلوم ہوا۔ کہ آج پھر آنسو پونچھ کر دونوں آنکھوں میں کاجل لگانا ہوگا۔ ہونٹوں میں پان کی دھڑی جما کر اور چہرہ پر پوڈر لگا کر پھر سے بازار میں بیٹھنا ہوگا۔ مسکراہٹ کے ساتھ کسی نئے آدمی کا شکار کرنا ہوگا۔

تب وہ گھر کے دروازے بند کر کے زمین پر لوٹ کر سر زمین پر پٹکنے لگی۔ دن بھر کچھ کھائے بغیر مردے کی طرح پڑی رہی۔ شام ہو گئی۔ روشنی کے بغیر گھر اندھیرا ہو گیا۔ اچانک ہی ایک پرانے دوست نے آکر دروازہ پھٹ پھٹ کر لیلا کو پکارنا شروع کیا۔ لیلا آواز پہچان

کر ہاتھ میں جھاڑو لئے دروازہ کھول کر اس آدمی پر شیرنی کی طرح جھپٹی۔ اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔

لیلا کا بچہ بھوک کے مارے رو رو کر چارپائی کے نیچے سو گیا تھا۔ وہ بھی اس شور و غل سے جاگ اٹھا اور ماں ماں کہہ کر رونے لگا۔

تب لیلا اس روتے بچے کو چھاتی سے چپکا کر باہر دوڑی اور ایک کوئیں میں کود پڑی۔

آواز سن کر پڑوسی ہاتھ میں روشنی لے کر وہاں پہنچے۔ لیلا اور اس کا بچہ کنوئیں سے نکال لیا گیا۔ لیلا اس وقت بیہوش تھی اور بچہ مر چکا تھا۔ ہسپتال میں جا کر لیلا تندرست ہو گئی۔ خودکشی اور ایک جان کے تلف کرنے کے الزام میں مجسٹریٹ نے اُسے سشن سپرد کر دیا۔

سشن جج بابو کندن لعل تھے۔ اُن کے حکم سے لیلا کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ بدقسمت کی عمر کا خیال کرتے ہوئے وکیلوں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھانسی کی سزا بحال رہی۔

کندن لال ایک طرف تو ہندو عورتوں کو دیوی کا رتبہ دیتے ہیں اور دوسری طرف عورت ذات کو قابلِ اعتبار نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہندو لڑکیاں اپنے خاندانوں کی پابندیاں اور اصول توڑنے کو ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ اگر سماج — ہندو سماج کا پردہ

ہٹا دیا جائے تو ایک بھی خاندانی عورت سماج کے پنجرے میں نہ ملے گی۔
اُن کے ایسے خیال کا ایک سبب بھی ہے۔ وہ سبب جاننے کیلئے
کُندن لال کی جوانی کا کچھ حال جاننا ضروری ہے:-
کُندن لال جب کالج کے سیکنڈ ایر میں تھے۔ تب ان کے خیالات
اور پسند نرالے ڈھنگ کی تھی۔ سونے کا چشمہ۔ فیشن ایبل داڑھی اور انگریزی
فیشن کے بال ان کو بہت پسند تھے اس وقت زیبائش پر زیادہ راغب
تھے۔ شراب۔ گوشت سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ اوراسی کے ساتھ ایک آدھ
اور عادتیں بھی تھیں۔ لیکن اب اُن کے سر پر چوٹی ہے۔ اور روزانہ اپنے
ہاتھ سے حجامت کرکے صفائی کا نمونہ پیش کرتے ہیں
ان کے گھر کے پاس ہی ایک اور خاندان رہتا تھا۔ ان کے رادھا
نام کی ایک بیوہ لڑکی تھی۔ اس کی عمر اس وقت قریباً ۱۶ سال تھی۔
سمندر میں سفر کرتے ہوئے۔ کنارے کی جو بہار دکھائی دیتی ہے
وُہ کنارے پہنچنے پر دکھلائی نہیں دیتی۔ جوگی کی آڑ سے رادھا دنیا سے
جتنی دُور چلی گئی تھی۔ اسے وہ راحت کا گھر سمجھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی
کہ اس ظالم دُنیا سے جتنا دُور چلی گئی ہے۔ اُتنا ہی اُسے دُنیا سے محبت ہو
گئی ہے۔ اِسے وہ راحت کا گھر سمجھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دُنیا
کے پُرزے بہت ہی سخت لوہے کے بنے ہوگئے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس

ظالم دُنیا میں چلنا ایک جھیل میں کشتی پر چلنے کی طرح بالکل آسان ہے سب راستے سیدھے ہیں۔ راحت اس کے گھر کے در پر کھڑی ہے۔ اور جوانی اس کے کانپتے ہوئے دل کے اندر ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ جوانی کی مست ہوا نے اُسے بھلا دیا تھا۔ تمام نیلگوں آسمان — جیسے اُسی کی جوانی کی لہروں سے بھرپور تھا۔ اور زمین اُسی کے جوبن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

گھر میں اس کے ماں باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ دونوں بھائی صبح کھا پی کر سکول چلے جاتے تھے۔ اور سکول سے واپسی پر کھانا کھا کر نائیٹ سکول میں چلے جاتے تھے۔ باپ کی تنخواہ کم تھی۔ اس لئے گھر میں ماسٹر رکھنے کی توفیق نہ تھی۔

کام سے فرصت پا کر رادھا اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ بیٹھتی۔ بیٹھے بیٹھے لوگوں کی آمد و رفت دیکھا کرتی تھی۔ خوانچہ والے طرح طرح کی آوازیں لگاتے اور اپنا سامان بیچتے تھے۔ اُس کو سُن کر وہ سمجھتی تھی کہ خوانچہ والے راہگیر اور فقیر بہت راحت میں ہیں۔

صبح اور تیسرے پہر شام کو خوب بن ٹھن کر کندن بھی چھاتی اُبھار کر اسکی نظروں سے گُذرتے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نوجوان کے سب کچھ ہے۔ اور اسے سب کچھ دیا جا سکتا ہے۔ لڑکیاں جیسے کھلونوں کی زیبائش کر کے کھیلتی ہیں۔ ویسے ہی رادھا کندن لال کو دل ہی دل میں سب طرح سے

سجا کر دیوتا سمجھ کر کھیلتی تھی۔
کبھی کبھی شام کو وہ دیکھتی تھی کہ کندن لال کے گھر میں خوب روشنی ہے۔ ناچنے گانے والی کے گھنگروؤں کی آواز سے کمرہ گونج اٹھتا ہے ایسی رات کو وہ کندن لال کی کھڑکیوں میں سے سایہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں ہی ختم کر دیتی تھی۔ جوانی کی خواہشات ایک پنجرے میں بند پرندے کی طرح دل پہ چوٹیں پہنچاتی ہیں۔
رادھا۔ اپنے دیوتا کو عیش میں ڈوبے رہنے کے سبب سے اپنے دل میں کوستی تھی یا اُسے نفرت کرتی تھی؟ نہیں چراغ جیسے اپنی روشنی دکھلا کر پروانے کو اپنی طرف لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ویسے ہی کندن لال کا گانے بجانے کا شغل رادھا کو اپنی طرف راغب کر رہا تھا۔ وہ زیادہ رات تک اکیلی بیٹھی اُس کے گھر کی گونج کو سنا کرتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے مقابل اس گھر کے اندر —— اس محلس کے درمیان —— ایک نہایت پراگندا جال بچھا ہے۔ جو رادھا کو دور سے ایسے دکھلائی دیتا تھا۔ کہ اس رات کے اندر ایک پتھروں کی ہنسی نفرت کی لہریں لہرا رہی ہے۔
رادھا اپنے سنسان کمرہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اپنے ملی دیوتا کے لئے اپنی تمام زندگی ختم کر سکتی تھی۔

بد قسمت رادھا کی بد قسمتی سے اس کے دیوتا نے اس پر مہربانی کی
بہشت نے جب آکر دُنیا قایم کی تو بہشت بھی برباد ہوگیا۔ اور جس نے اپنے
دماغ میں۔ اپنے دل میں دلی دیوتا کو جگہ دے کر تمام رات آنکھوں میں
گذاری تھی۔ اس کی عزت پر بھی بٹہ لگ گیا۔

اس بیوہ پر کب کُندن لال کی نگاہ پڑی۔ اور کب اس کو غلط نام رکھ
کر خط لکھا۔ اور اُسے کئی قسم کے لالچ دے کر پُھسلا لیا۔ آخر کندن لال نے
بے صبر دل کی بے قراری سے بھرپور ایک خط پا یا۔ اس کے بعد ایک دن
اچانک ہی نہ معلوم کس طرح اِس دُنیا سے کہیں دُور چلی گئی۔

ایک دن آدھی رات کے وقت ماتا پتا اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر
رادھا کندن کے ساتھ کہیں بھاگ گئی۔ جب وہ کُندن کے پاس بیٹھی تو شرم و
حیا نے اُسے گھیر لیا ——— جیسے وہ مُردہ ہو۔

آخر جب گاڑی چلدی تو رادھا روکر کُندن لال کے پاؤں پر گر
پڑی اور کہنے لگی ——— ابھی مَیں تمہارے پاؤں پڑتی ہُوں۔ تم مجھے میرے
گھر پہنچا دو۔ کُندن لال نے جلدی سے اس کا مُنہ بند کر دیا۔ گاڑی تیزی
سے چلنے لگی۔

دریا میں ڈوب کر مرتے آدمی کو جیسے دم بھر میں زندگی کی سب
گذری باتیں یاد آجاتی ہیں۔ ویسے ہی اس بند گاڑی میں رادھا کو یاد

کھانے کے وقت اس کے والد بغیر اس کو کھلائے خود نہ کھاتے
تھے اور چھوٹے بھائی سکول سے آکر اس سے کھانا مانگتے تھے۔ اور یہ بھی
یاد آیا کہ صبح کو وہ اپنی ماں کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ اور شام کو ماں
اپنے ہاتھ سے اُس کے بال سنوارتی تھی۔ اُس وقت اسے یہ گاڑی دوزخ
کا پنجرہ معلوم ہونے لگا۔

وہ سوچنے لگی۔ دُنیا کے ہر گھر میں اس وقت ہر بشر سو رہا ہوگا۔ اسے
اپنے گھر میں اپنی چارپائی پر رات کے وقت بڑے آرام سے نیند آتی تھی۔
ہائے۔ یہ بات اُسے پہلے کیوں نہ یاد آئی۔ گھریلو عورتیں صُبح اُٹھ کر اپنی
گھریلو زندگی میں مصروف ہو جائیں گی۔ اور گھر سے نکلی ہوئی بدنصیب آوارہ
رادھا کی رات کہاں جا کر ختم ہوگی۔ صبح جب سُورج کی کرنیں اس کے گھر
میں پڑینگی۔ تب وہاں کیا ہوگا۔ بے شرمی کا چراغ خُوب تیز روشنی پھینکے گا۔
لوگ مجھے کیا کیا نہ کہیں گے؟

رادھا بہت روئی۔ چلائی۔ بہت عاجز ہو کر اس نے کہا۔ "ابھی
رات باقی ہے۔ میری ماں اور دونوں بھائی ابھی نیند میں ہونگے۔ مجھے ابھی
گھر پہنچا دو۔"

جیسے جال میں پڑی ہوئی مچھلی تڑپ تڑپ کر خون کے آنسو روتی
ہے۔ مگر ماہی گیر کے جسم پہ جوں تک نہیں رینگتی۔

بالکل وہی بات کندن لال نے ادھر کان نہ دھرے ۔ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں سوار کرا کر کہیں لے چلا ۔

کندن لال کی زندگی میں سے صرف ایک واقعہ کا ہی ذکر کرتے ہیں بداخلاقی کے خیال سے دُوسرے واقعات کو سُپرد قلم نہیں کیا گیا ۔

اس وقت اُن دفنائے مُردوں کو نکالنے کی ضرورت نہیں ۔ میں غلط نام رکھے ہوئے آدمی کا کچھ نام و نشان ہے یا نہیں لیکن اس وقت کندن لال پاک خیالات رکھتے ہوئے موجُود ہے ۔ وہ روزانہ پُوجا کرتے ہیں ۔ اور ہمیشہ دھارک باتیں کرتے ہیں ۔ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی دھارمک تعلیم دیتے ہیں اپنی عورتوں کو بھی در پردہ ہی رکھتے ہیں ۔ جہاں کسی غیر کی نگاہ نہ پڑ سکے ۔ لیکن خود ایک وقت کئی دوشیزاؤں کی عصمت لُوٹ چکے تھے ۔ اسی سبب سے آج عورتوں کے سب سماجک گناہوں کی سخت سزا دیتے تھے ۔

رادھا کو پھانسی کا حکم دینے کے دو دن بعد کندن لال جیل خانہ کے باغ میں سبزی لینے گئے ۔ اس وقت انہیں دیکھنے کی بڑی خواہش ہوئی کہ آیا رادھا اپنے گناہوں کا کفارا کر رہی ہے یا نہیں جیل میں جہاں عورتیں قید رکھی جاتی تھیں ۔ وہ وہاں پہنچے ۔

دُور سے انہیں لڑائی جھگڑے کا شور سنائی دیا ۔ اندر جا کر دیکھا کہ رادھا پہرے داروں سے جھگڑ رہی ہے ۔ کندن لال اپنے دل میں

سلسے۔ سوچا عورتوں کی عادت ہی ایسی ہوتی ہے۔ موت سر پر موجود ہے۔ تو بھی لڑنا نہیں چھوڑتیں۔ یہ شاید مرکر بھی فرشتۂ موت سے جھگڑے بغیر نہ رہیں گی۔

کندن لال نے سوچا اس وقت کوشش کر کے رادھا کو اپنے گناہوں کا کفارا کرنے کے لئے مجبور کرنا چاہئے۔ اسی خیال سے جب وہ رادھا کے پاس پہنچے۔ ویسے ہی رادھا ہاتھ جوڑ کر بولی "جج صاحب۔ دہائی ہے آپ کی۔ اس سے کہیں کہ میری انگوٹھی مجھے دیدے۔"

پوچھنے سے معلوم ہوا کہ رادھا کے بالوں میں۔ ایک انگوٹھی چھپی ہوئی تھی۔ اچانک ہی سپاہی کی نظر اس پر پڑی اور اس نے اسے چھین لیا۔

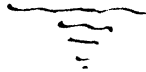
کندن لال پھر بھی ہنسے۔ کل پھانسی مل جائے گی۔ تب بھی انگوٹھی کی تمنا نہیں جاتی۔ زیور ہی عورتوں کا سب کچھ ہے۔

پہرے دار سے کندن لال نے کہا "کہاں ہے وہ انگوٹھی" پہریدار نے انگوٹھی انہیں دیدی۔

جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ کندن لال کے ہاتھ میں رکھ دیا ہو۔ اس طرح وہ چونک پڑے۔ انگوٹھی میں ایک طرف ہاتھی دانت پہ ایک نوجوان کی فوٹو تھی اور دوسری طرف نام۔

تب کُندن لال نے انگوٹھی سے نگاہ ہٹا کر رادھا کی طرف دیکھا۔ پچیس برس پہلے کی بات یاد آگئی۔ "نہیں یہ تو وہی ہے!"

کُندن لال نے پھر ایک بار اس انگوٹھی کو دیکھا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ سر اُٹھایا جب اُن کی نگاہ رادھا پر پڑی۔ تب رادھا کا مُنہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور کُندن لال اس کے شعلۂ رخ کی تاب نہ لا کر باہر چلے گئے۔



نزدیک مگر — دُور

وہ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ مگر میں بیدار نہ ہوا۔ مجھ بدقسمت کی اس نیند کو لعنت ہے۔

وہ ایسے وقت آیا۔ جب رات کا سناٹا تھا۔ اس کی بین اُس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کی مدھر راگنیوں سے میری نیند معمور ہو گئی۔

ہائے میری راتیں اس طرح کیوں ضائع ہوتی ہیں؟

ارے میں اُس کے درشن سے کیوں محروم رہتا ہوں جس کی خوشبو میری نیند کو چھُوتی ہے۔ جو میرے اتنا نزدیک آ جاتا ہے۔



شعلۂ یاس

افسانہ نمبر ۱

حقیقی وجود

جیسے مَیں اپنے نام سے پکارتا ہوں۔ وہ اس قید خانے میں رو رہا ہے۔ مَیں ہمیشہ اپنے سب اطراف ایک دیوار کے بنانے میں معروف رہتا ہوں۔ اور جُوں جُوں یہ دیوار اونچی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اندھیرے سایہ میں میرا حقیقی وجود میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے۔

مَیں اس بلند دیوار پہ غرور کرتا ہوں۔ اور مٹی و ریت کا گارا اس پہ لگاتا ہوں کہ کہیں اس دیوار میں معمولی سا سوراخ نہ رہ جائے۔ اور اس تمام فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ میرا حقیقی وجُود میری نظر سے اوجھل ہوتا جاتا ہے۔

شعلہ باس

دُنیا اور بہشت کے درمیان ایک اور خدائی حکومت ہے۔ جس کی باگ ڈور "راجہ نوشنکر" کے ہاتھ میں ہے۔ اس خوشنما اور عجیب سلطنت کا نام ہے ــــ "ہوتا تو ہو سکتا" جن لوگوں نے دُنیا میں نیک کام کر کے عزت پائی ہے۔ اور جن لوگوں نے اپنی شان کی پروا نہ کرتے ہوئے مفلسوں اور محتاجوں کی بلا کسی خیال کے امداد کی ہے وہ بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا نام دُنیا میں سورج کی طرح روشن ہے۔ اور رہے گا۔ لیکن جو لوگ تقدیر کے ہیر پھیر میں رہتے ہیں۔ ان کا کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔

ہمارے روشن بابو بھی اِسی عادت میں مبتلی تھے۔ وہ نوجوان تھے
سب کا یہی خیال تھا۔ کہ اگر وہ خواہش کرتے۔ تو سبھی باتوں میں کامیاب
ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی وقت بھی انہوں نے کوئی خواہش ظاہر نہ کی۔ اور
نہ ہی کوشش کی۔ لیکن گھر میں سب کا خیال تھا کہ اگر روشن محنت کرے۔
تو امتحان میں اوّل نمبر پہ پاس ہوگا۔ لیکن اُس نے امتحان ہی نہ دیا۔
یقین تھا۔ اگر وہ کسی محکمہ میں ملازمت کرتے تو اب تک کسی اعلیٰ عہدہ
پر مامور ہوتے۔ مگر انہوں نے نوکری ہی نہ کی۔ عام لوگوں سے اُنہیں
نفرت تھی۔ کیونکہ وہ عزت دار تھے۔ خاص لوگوں سے انہیں کوئی سروکار
نہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتے۔ تو بھی وہ خاص آدمی بن سکتے تھے

روشن کی شادی ایک رئیس کی لڑکی سے ہوئی تھی اسی لئے
اُسے روزی کا فکر نہ تھا۔ وہ دولت مند سسر اور خوبصورت بیوی
پاکر ایک قسم سے بے فکر تھا۔ بیوی کا نام تھا شکنتلا۔

بیوی کا یہ نام انہیں پسند نہ تھا۔ اور اسے بھی اپنے قابل نہ سمجھتے
تھے لیکن بیوی کے دل میں خاوند کی عزت تھی۔ سب عورتوں کے
خاوندوں سے اس کے خاوند بہت لائق ہیں۔ اسی خیال سے وہ
کچھ کچھ مغرور سی رہتی۔ اس کا خاوند بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔
شکنتلا کو ہر بات میں یہی کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں میرے خاوند کی عزت پر

بٹہ نہ لگ جائے۔ اور مجھے نیچا دیکھنا پڑے۔ اُسے اپنے خاوند کی عزت کا خیال تھا۔ وہ اگر اپنے دل کی قُربانی دے کر بھی اپنے خاوند کی خدمت کر سکتی تو تیار تھی۔ اسی میں اپنی زندگی گذار دینا چاہتی تھی۔ اس کیلئے وہ سب کچھ بغیر کسی تکلیف کے کرنے کو تیار تھی۔

روشن جب کالج میں پڑھتا تھا۔ تو سُسرال میں ہی رہتا تھا۔ جب امتحان کا وقت آیا۔ تو وہ امتحان دینے نہ بیٹھا۔ اور دُوسرے برس پڑھنا بھی چھوڑ دیا۔

اس واقع سے شکنتلا کے دل کو چوٹ پہنچی۔ ایک دن رات کو آہستہ سے اس نے اپنے خاوند سے کہا۔ "امتحان دے ڈالتے تو اچھا ہی تھا"!

روشن نے لاپرواہی سے ہنس کر کہا " تو تمہارا خیال ہے۔ کہ امتحان دینے سے ہی لیاقت حاصل ہوتی ہے؟ —— ہمارے لام ناتھ بھی تو امتحان پاس کر چکے ہیں۔"

پڑوسن کملا اپنی لڑکپن کی سہیلی شکنتلا کو اپنے بھائی کیلاش کی امتحان میں کامیابی کی خوشخبری سُنانے آئی۔ یہ سُنتے ہی شکنتلا کے دل میں آیا۔ کہ یہ خوشی نہیں بلکہ مجھے طعنہ زنی کر رہی ہے۔ اسی لئے خوشی ظاہر نہ کر کے سنجیدگی سے بولی "الیف۔ اے کا امتحان بھی کوئی امتحان ہے۔ یہاں تک

کہ ولایت کے بی۔اے سے کم تو کوئی امتحان ہی نہیں ہے"۔

خوشخبری سُنانے آتی ہوئی کملا ــــــ پہلے تو اپنی سہیلی کی یہ بات سُن کر حیران ہوئی لیکن وہ بھی تو عورت تھی۔ اس نے شکنتلا کی دلی باتوں کو بھانپ لیا۔ بھائی کی بے عزتی ہوتی دیکھ کر اُسے بھی غصّہ آگیا اُس نے کہا "بہن میں ولایت تو گئی نہیں۔ اور نہ ہی میری شادی ولایت سے ہو آنے والے خاوند سے ہوئی ہے۔ میں یہ باتیں کیسے جان سکتی ہوں۔ میں بیوقوف عورت ٹھہری۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ بنگالی لڑکے کو الیف۔اے کا امتحان دینا ہوتا ہے۔ اور وہ بھی سب نہیں دے سکتے"۔

یہ کہہ کر کملا وہاں سے چلی گئی۔ لڑائی نہ بڑھانے کے سبب سے شکنتلا یہ سب کچھ سُن کر اپنے کمرہ میں جا کر خُوب روئی

کچھ عرصہ بعد ایک دُور رہنے والا خاندان کلکتہ میں شکنتلا کے والد کے ہاں ٹھہرا۔ جس سے شکنتلا کے والد راجکمار بابو کے ہاں بڑی دھوم دھام ہوئی۔ روشن جس بڑے کمرے میں رہتے تھے۔ اُس کو چند دنوں کے لئے خالی کر کے کسی دُوسرے کمرے میں رہنے کو کہا گیا۔

اس واقع سے روشن بہت ناراض ہوا پہلے شکنتلا کے پاس گیا۔ اس کے والد کی چُغلی کر کے۔ اُسے بُلا کر اپنا بدلہ لیا اُس کے بعد کھانا نہ کھایا اور سب پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر شکنتلا بہت ہی شرمندہ

ہوئی۔ اس نے اپنے خاوند کو ہاتھ جوڑ کر بڑی مشکل سے متانت سے راضی کیا۔

شکنتلا سمجھدار تھی۔ اس نے اپنے والدین کو قصوروار نہ ٹھہرایا۔ اُس نے سوچا ــــــ یہ بات کچھ بھی نہیں ہے ساتھ ہی یہ بات بھی اس کے دل میں آئی۔ کہ اس کا خاوند سسرال میں رہ کر اپنی آبرو خود بیچ رہا ہے۔

اُس دن سے شکنتلا ہر روز اُسے کہنے لگی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ مَیں یہاں نہیں رہوں گی۔

روشن کے دل میں غرور تو بہت تھا مگر اپنی حالت کا خیال کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے غریب کنبہ میں واپس جانے میں وہ بالکل رضامند نہ تھا۔ تب شکنتلا نے مصمم ارادہ کر کے کہا۔ "اگر تم نہ جاؤ گے تو مَیں اکیلی ہی چلی جاؤں گی"۔

روشن دل میں ناراض ہو کر اپنی عورت کو کلکتہ کے پاس باہر کے گاؤں میں اپنے کچے اور خستہ مکان میں لے جانے کی سوچنے لگا۔ سفر کے وقت شکنتلا کے والدین نے اپنی لڑکی سے کچھ دن اور میکے ٹھہرنے کو کہا۔ شکنتلا نے خاموش رہ کر اپنی نارضامندی ظاہر کر دی۔

اُس کا مصمم ارادہ دیکھ کر اس کے والدین کو شبہ ہوا۔ کہ شاید بغیر علم کے اس کے دل کو کوئی چوٹ پہنچائی گئی ہو۔ ساجکما رتے بڑی نرمی سے

پوچھا" بیٹی! کیا ہماری کسی بات سے ناراض ہوگئی ہو؟"
شکنتلا نے اپنی ذلیل نگاہوں سے اپنے والد کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کبھی نہیں میں یہاں بڑے آرام سے رہی ہوں" یہ کہہ کر وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ مگر اس کا ارادہ مصمم تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔
والدین نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے دل میں کہا۔ خواہ کتنے لاڈ۔ پیار سے پرورش کرو۔ مگر شادی کے بعد لڑکی غیر ہو جاتی ہے۔
آخر شکنتلا روانی ہوئی۔ سب کو چھوڑ کر وہاں سے چل کر پالکی میں سوار ہوگئی

(۲)

کلکتہ کے امیر گھر۔ اور گاؤں کے غریب گھر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے لیکن شکنتلا نے کبھی بھی اس بات کا خیال نہ کیا۔ بلکہ گھر کے سب کاموں میں ساس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ روشن کے گھر کی غریبی دیکھ کر راجکمار نے ایک خادمہ شکنتلا کے ساتھ کر دی۔ لیکن شکنتلا نے گاؤں پہنچتے ہی اُسے واپس بھیج دیا۔ اُسے خیال تھا کہ بڑے گھر کی نوکرانی غریب گھر کی ہر بات پر ناک بھوں چڑھایا کرے گی۔
ساس محبت کے مارے ہر وقت خفتی کاموں سے شکنتلا کو روکتی لیکن شکنتلا خوشی خوشی سب کام کر دیتی تھی۔ بس سے اس نے اپنی ساس

کے دل پر قبضہ کر لیا۔ بہو پہ ساس ہی کیا۔ سب گاؤں خوش تھا۔

لیکن اس کا اثر اچھا نہ نکلا۔ کیونکہ دُنیا کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔ اسی سے سب کاموں کا انجام اچھا ہی نہیں نکلتا۔

روشن کے ایک بڑا اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ بڑا بھائی پنجاب میں نوکر تھا۔ ہر ماہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر پچاس روپیہ بھیجتا تھا۔ جس سے گھر کا کام چلتا تھا۔ اور دونوں چھوٹے بھائی پڑھتے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کل گھر کے خرچ کے لئے پچاس روپے بہت کم ہیں۔ لیکن بڑے بھائی کی بیوی پدما کے غرور کے لئے اتنے روپے ہی کافی تھے۔ خاوند سال بھر نوکری میں لگا رہتا تھا۔ اس لئے اس کی بیوی سال بھر آرام کرتی تھی۔ وہ کچھ کام کاج نہ کرتی تھی۔ تب بھی سارا کنبہ اس کے زیرِ احسان تھا۔

شکنتلا جب کلکتہ سے آکر دن رات گھر کے کام میں رہنے لگی تب پدما کے کمینہ دل میں جلن پیدا ہوئی۔ ساس نے دل میں سوچا کہ بڑے گھر کی لڑکی چھوٹے چھوٹے کام کر کے مجھے نظروں سے گرانا چاہتی ہے۔ اُسے چھوٹی بہو کی عاجزی میں غرور اور بڑاپن نظر آنے لگا۔

روشن نے گاؤں آکر ایک لائبریری قائم کی۔ پندرہ بیس سکول کے لڑکوں کو جمع کر کے خود صدر بن گیا۔ بڑے بڑے اخباروں میں وہاں

کی خبریں بھیجنے لگا۔ مگر گھر میں ایک پیسہ بھی نہ آتا۔ بلکہ خرچ اور بڑھ گیا۔
شکنتلا بار بار اسے ملازمت کرنے کو کہنے لگی۔ مگر اس نے اس پر کان نہ دیئے۔ بیوی سے کہا "میرے لایق نوکریاں ضرور ہیں۔ لیکن انگریز ان جگہوں پر بڑے بڑے انگریزوں کو ہی ملازم رکھتے ہیں"۔ اصلیت یہ بھی کہ اس نے کبھی ملازمت کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

پدما۔ اپنے دیور اور دیورانی کو طعنہ زنی کرنے لگی۔ غرور کے ساتھ اپنی غریبی کا ذکر کر کے کہتی "ہم غریب آدمی ہوئے۔ بڑے آدمی کی لڑکی اور داماد کی پرورش کیسے کر سکتے ہیں۔ وہاں تو مزے میں تھے۔ کوئی تکلیف نہ تھی۔ یہاں سوکھی روٹیاں کس طرح کھائی جائیں گی؟"

ساس بڑی بہو سے ڈرتی تھی۔ اس لئے شکنتلا کی طرف سے کچھ بھی نہ بول سکتی تھی۔ اور نہ ہی بولنے کی ہمت ہوتی تھی۔ شکنتلا بھی چپ چاپ سب باتوں کو برداشت کرنے لگی۔

انہیں دنوں روشن کے بڑے بھائی چھٹیوں میں گھر آئے۔ بیوی کی باتوں سے ان کی نیند حرام ہو گئی۔ آخر ایک دن وہ روشن سے بولے "تمہیں ملازمت تلاش کرنی چاہیئے۔ میں اکیلا گھر کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکتا ہوں؟"

روشن لاٹھی کھائے ہوئے سانپ کی طرح لمبی سانس لے کر اپنے دل میں سوچنے لگا۔ دو دفعہ۔ سوکھی روٹی کھلا کر بیوی کو طعنہ زنی کرنا

اور بھائی کا ملازمت کرنے کے لئے کہنا ـــــ وہ اسی وقت بیوی کو ساتھ لے کر سسرال جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

لیکن شکنتلا وہاں جانے کے لئے رضامند نہ ہوتی۔ اس نے رائے ظاہر کی کہ بڑے بھائی کی روٹی اور بھاوج کی گالیاں کھانا چھوٹے بھائی کا خاندانی حق ہے۔ مگر سسرال میں جا کر رہنا بہت شرمندگی کی بات ہے۔ کیونکہ اس پر کوئی دعوے نہیں ہے۔ شکنتلا سسرال میں ہر طرح کے ظلم برداشت کر کے بھی رہ سکتی ہے۔ مگر باپ کے اپنی عزت بنائے رکھ کر سر اٹھا کر رہنا نہیں چاہتی۔

اُسی وقت گاؤں کے ہائی سکول میں تھرڈ ماسٹر کی جگہ خالی ہوئی روشن کے بھائی اور شکنتلا نے کئی دفعہ وہاں نوکری کرنے کو کہا۔ مگر اس کا نتیجہ بھی اُلٹا ہی نکلا۔ اپنے حقیقی بھائی اور بیوی کو ایسی چھوٹی ملازمت کرنے کے لئے مجبور کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت ناراض ہوئے۔

تب بڑے بھائی نے بہت سی میٹھی باتوں سے خاموش کیا سب نے اپنے دل میں کہا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ روشن گھر میں ہی رہے۔ کہیں ناراض ہو کر چلا نہ جائے۔ یہی غنیمت ہے۔

چھٹی ختم ہونے پر بڑے بھائی نوکری پر چلے گئے۔ پدما کچھ دن تک مُنہ پھلائے پھرتی رہی۔ روشن نے شکنتلا سے کہا: "آج کل ولایت

گئے بغیر کوئی اچھی نوکری نہیں مل سکتی۔ میں ولایت جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم اپنے باپ سے کچھ روپیہ مانگو۔"

ایک تو ولایت جانے کی بات سن کر ہی شکنتلا کا کلیجہ دھک سے بیٹھ گیا۔ اور اس کے علاوہ باپ سے روپیہ مانگنے کی بات سن کر وہ تو جیسے شرم سے مر ہی گئی۔

وہ باپ کے ہاں نہ گئی۔ اور نہ ہی روپیہ کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کیا۔ اس سے روشن اپنی بیوی سے خوب اُلجھے یہاں تک کہ بولنا بھی بند کر دیا۔ روتے روتے شکنتلا کی آنکھیں پھول گئیں۔ اسی طرح کئی دن گذرے۔

آخر دُرگا پُوجا کے دن نزدیک آئے۔ دُرگا پُوجا بنگالیوں کا ایک بڑا بھاری تہوار ہے۔ لڑکی اور داماد کو بُلانے کے لئے راجکمار نے بہت سا سامان اور آدمی بھیجے۔ سال بھر بعد لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ اپنے والد کے گھر آئی۔ اس دفعہ داماد کی پہلے کی نسبت بہت خاطر ہوئی شکنتلا بھی خوش تھی۔

اس دن چھٹھ تھی۔ کل ساتویں ہوگی۔ دُھوم دھام۔ شور و غل کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ دُور اور نزدیکی رشتہ داروں سے بابو راجکمار کا گھر بھر گیا۔

رات کو کام کاج سے تھکی ہوئی شکنتلا جلدی ہی سوگئی۔ پہلے جس
کمرہ میں شکنتلا رہتی تھی۔ یہ وہ کمرہ نہ تھا۔ اب کے زیادہ عزت دکھانے
کے لئے راجکمار نے اپنا خاص کمرہ شکنتلا کو رہنے کے لئے دیا تھا۔ روشن
کب سونے کے لئے کمرہ میں آیا۔ اس کا شکنتلا کو کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ گہری
نیند میں خراٹے لے رہی تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی شور وغل ہونے لگا۔ مگر تھکی ہوئی شکنتلا
کو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ وہ مزے میں سو رہی تھی۔ کملا اور موہنی دو سہیلیاں
چھپ کر بیوی خاوند کی باتیں سننے کے لئے شکنتلا کے بند دروازہ کے
باہر کان لگائے کھڑی تھیں۔ مگر کوئی آواز نہ سن کر دونوں کھکھلا کر ہنس
پڑیں اور اس ہنسی کی آواز سے شکنتلا کی نیند ٹوٹ گئی۔ روشن کب اس
کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس کا بھی اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ شرمندہ ہوگئی
آخر پلنگ سے نیچے قدم رکھتے ہی اس کی نظر اپنی ماں کے لوہے کے
صندوق پر پڑی۔ صندوق کھلا تھا۔ اس کے اندر راجکمار کا بوکا "کیش
بکس" رہتا تھا اور اب وہ گم تھا۔

تب اسے یاد آیا کہ کل ماں کی چابیوں کا گچھا گم ہو جانے سے بڑی
کھلبلی مچی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ انہیں چابیوں سے ہی کسی
نے یہ چوری کی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ چوروں نے کہیں اس کے

خاوند کو کوئی ضرب نہ پہنچائی ہو۔ دل دھڑکنے لگا۔ پلنگ کے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ ماں کی چابیوں کے گچھے کے نیچے ایک خط پڑا ہے۔

یہ خط اسی کے خاوند کا تھا۔ لکھا تھا کہ میں نے کسی دوست کی مدد سے ولایت کا ٹکٹ خرید لیا ہے۔ اب وہاں کے اخراجات کے لئے کوئی انتظام نہ دیکھ کر سسر کا روپیہ ہی چوری کیا ہے۔ جہاز آج صبح ہی روانہ ہوگا۔

خط پڑھ کر شکنتلا کا جسم کانپ اٹھا۔ تمام خون ٹھنڈا ہو گیا۔ چارپائی کا پایہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت تمام بنگال بھر لوگ خوشیوں میں مست تھے۔

گھر بھر میں شور و غل مچ گیا۔ سب خوش تھے۔ اتنا دن گذر جانے پر بھی جب شکنتلا کا کمرہ نہ کھلا۔ تب کملا اور موہنی ہنستے ہنستے اس کے کواڑ تھپتھپانے لگیں۔ تب بھی کچھ جواب نہ پا کر وہ شکنتلا کا نام لے کر پکارنے لگیں۔

شکنتلا نے بھری آواز میں کہا "آتی ہوں۔ تم چلو"

دونوں سہیلیاں اس کی طبیعت خراب ہونے کے شبہ میں اس کی والدہ کو بلا لائیں۔ ماں نے آکر کہا "بیٹی کیسی طبیعت ہے۔ ابھی تک دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟"

شکنتلا نے روتے ہوئے کہا۔ "ذرا بابوجی کو بلاؤ!"
اماں بہت ڈریں۔ اسی وقت اپنے خاوند کو بلا لائیں۔ شکنتلا جلدی سے دروازہ کھول کر ماں اور باپ کو اندر لے گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

تب شکنتلا زمین پر لوٹ کر اور اپنے باپ کے پاؤں پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو کر کہنے لگی۔ "بابوجی۔ مجھے معاف کریں۔ میں نے تمہارے صندوق سے روپے نکال لئے ہیں"

ماں اور باپ سناٹے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

شکنتلا نے کہا "اپنے خاوند کو ولایت بھیجنے کے لئے میں نے یہ کام کیا ہے"۔

باپ نے پوچھا۔ "تم نے ہم سے کیوں نہ مانگے؟"

"آپ ولایت جانے میں روک ٹوک نہ کریں۔ اسی لئے میں نے ایسا کیا ہے"!

راجکمار دل میں بہت ناراض ہوئے۔ ماں بیٹی رونے لگیں۔

کلکتے میں چاروں طرف خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

جو شکنتلا باپ سے روپیہ نہ مانگ سکی۔ اور جو اپنے خاوند کی اس چوری کے الزام کو اپنے ماں باپ سے چھپا سکتی ہو۔ اس کی عزت، آبرو

خاک میں مل گئی ۔ اس کا غرور سب کے پاؤں تلے کچلا جانے لگا۔ پہلے ہی سے مشورہ کرکے اور چابیاں چوری کرکے خاوند اپنی بیوی کی مدد سے روپیہ چُرا کر ولایت چلا گیا ہے۔ اس بات کا ذکر ہر رشتہ دار کی زبان پر تھا۔ بند دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر کملا موہنی ۔ رشتہ داروں اور سب نوکروں سے باتیں سُن لی تھیں ۔ لڑکی کے کمرہ سے گھبراہٹ میں ماں باپ کو جاتے دیکھ کر سب لوگ کمرہ میں جمع ہو گئے ۔مگر شکنتلا نے کسی سے بات نہ کی ۔اور اسی کمرہ میں بغیر کھائے پڑی رہی ۔اس کے اس طریقہ سے کسی کو کچھ تکلیف یا فکر نہ ہوا ۔ تہوار ختم ہو گیا ۔

(۲)

بے عزت ہو کر شکنتلا اپنے سسرال آئی ۔ وہاں بیوہ ساس اور شکنتلا ۔۔۔ مصیبت زدہ شکنتلا کی آپس میں اور بھی بن آئی ۔ دونوں میں محبت بڑھ گئی ۔ دونوں ایک دوسرے کی تکلیفوں کا اندازہ کرکے دل ہی دل میں جلنے لگیں ۔اب دونوں گھر کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے لگیں ۔ شکنتلا سوچتی ۔ساس جتنا نزدیک آئی والدین اتنا ہی دُور ہو گئے ۔

روشن بابو پہلے تو ولایت پہنچ کر برابر شکنتلا کو خط لکھتے رہے لیکن بعد میں خط آنے کم ہو گئے ۔اور جو آتے بھی اُن سے نفرت ظاہر ہوتی روشن جیسے لاپرواہ

آدمی اگر گھر کے کام کاج میں لگی رہنے والی عورت کو نفرت سے دیکھنے لگیں۔ تو کوئی نئی بات نہیں۔

لیکن جب روپیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اس بنگالی لڑکے کو اپنی بیوی کو تار دینے میں ذرا بھی شرم نہ آئی۔ اور اس بنگالی عورت نے اپنی ہاتھ کی چوڑیوں کو چھوڑکر سب زیورات فروخت کر کے اپنے خاوند کو روپیہ بھیج دیا۔ اور اپنے خط کے ہر لفظ کو اپنے آنسوؤں سے بھگو بھگو کر خاوند کو واپس گھر آجانے کو لکھا۔

روشن بابو انگریزی فیشن میں ملبوس بیرسٹری پاس کر کے گھر لوٹ آئے۔ آکر وہ کلکتہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ باپ کے گھر رہنا ناممکن تھا۔ کیونکہ ایک تو بیرسٹر صاحب کے لائق وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ دوسرے گاؤں کے لوگ اُسے برادری سے الگ رکھیں گے۔ روشن کے سسر بھی پرانے خیالات کے تھے۔ وہ بھی اُسے اپنے گھر نہ رکھ سکتے تھے۔

روپیہ کی کمی کے سبب سے روشن ہوٹل چھوڑکر ایک کرایہ کے مکان میں رہنے لگا۔ اس گھر میں اپنی بیوی کو لانا نہ چاہتے تھے۔ ولایت سے آنے پر صرف ایک گھنٹہ کے لئے ماں اور بیوی کو ملنے وہ گاؤں گئے تھے۔ اُس کے بعد پھر کبھی ملاقات نہ کی۔

دونوں عورتیں اسی بھروسہ پر خوش تھیں۔ کہ روشن اپنے دلیش

میں واپس آگیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے بیرسٹر بن کر آنے سے وہ بہت ہی خوش تھیں۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ شکنتلا اپنے کو اپنے خاوند کے قابل نہ ہونے پر اپنے آپ کو دھتکارنے لگی۔

جب روشن اپنے گھر کا خرچ بھی نہ چلا سکے۔ تب اس نے یہ سوچا۔ کہ ہندوستان میں لیاقت کی قدر نہیں ہے۔ اور ان کے ہم پیشہ لوگ ان کی عزت کو دیکھ کر حسد کے مارے ان کی عزت میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ جب ان کی میز پر انڈوں کی جگہ سبزی نے لے لی۔ اور بھنے ہوئے مرغے کی بجائے مچھلی ملنے لگی۔ اور ٹھاٹ باٹ پھیکا پڑنے لگا۔ تب اسی وقت راجکمار بابو کے ہاں دردناک واقع ہوا۔ جس سے روشن نے ادھر منہ کیا۔ راجکمار بابو کا لڑکا اپنی بیوی کو لے کر گھر واپس آرہا تھا۔ اچانک کشتی اُلٹ جانے سے میاں بیوی کی موت ہوگئی۔ اب ان کی دولت کی واحد مالکہ شکنتلا تھی۔

کچھ دنوں بعد جب راجکمار اس صدمہ کو برداشت کر چکے۔ تو ایک دن وہ روشن کے ہاں گئے۔ اور بولے "بیٹا۔ اب تم کو براہمنوں کو کھانا دیکر برادری میں ملنا چاہئے۔ کیونکہ میرا تمہارے بغیر کوئی نہیں ہے۔"

روشن جلد ہی رضامند ہوگیا۔ اُس نے سوچا جو لوگ ڈرائنگ روم اور لائبریریوں میں بیٹھ کر اُن سے حسد کرتے تھے۔ اُن سے اس طرح بدلہ چکانا ہوگا۔

راجکمار نے پنڈتوں کو لکھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ روشن نے اگر ولایت میں گوشت نہ کھایا ہو۔ تو برادری میں کھانا دیکر برادری میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ولایت میں گو ہر چیز میں گوشت شامل تھا۔ تو بھی اس بات میں انکار کرنے میں روشن کو ذرا بھی ڈر معلوم نہ ہوا۔ اپنے دوستوں سے کہنے لگے "سماج جب اپنی خواہش سے مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہی ہے تب ایک ذرا سی بات کہہ کر اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جس زبان سے گوشت کھایا ہو۔ اُسے گوبر اور جھوٹ بولے ہوئے دو لفظوں سے پاک کر لینا ہمارے سماج کا ایک اصول ہے میں اس اصول کے خلاف جانا نہیں چاہتا۔

برادری میں ملنے کے لئے ایک دن مقرر ہو گیا۔ اسی درمیان میں روشن نے صرف دھوتی ہی نہیں پہنی۔ بلکہ محبت کے ساتھ ولایتی اشیاء پر سیاہی اور برادری اور سماج کے منہ پر سفیدی بھی پھیرنے لگے جس نے سُنا وہی خوش ہوا۔

خوشی سے شکنتلا آپے سے باہر ہو گئی۔ اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اس نے کہا "ولایت سے جو آتا ہے۔ وہ صاحب بن کر آتا ہے۔ لیکن میرے خاوند اپنے پُرانے خیالات میں ہی لوٹے۔ وہ ہندو دھرم کی پہلے سے

بھی زیادہ عزت کرتے ہیں۔"

مقررہ دن براہمنوں، پنڈتوں سے راجکمار بابو کا گھر بھر گیا۔
ان کے کھانے اور دان کا خوب خیال رکھا گیا تھا۔

گھر کے اندر زنانخانہ میں بھی خوب دھوم تھی۔ رشتہ داروں۔
پڑوسیوں کے کھانے کا بہت اعلیٰ انتظام تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں شکنتلا
ایکادشی کے چاند کی طرح خوشی خوشی ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ آج کے دن
دُنیا کا ہیرو اس کا خاوند تھا۔ روشن بابو۔ جیسے آج ولایت سے واپس
آکر ہندو دھرم میں شامل ہو کر اُس کی شان دوبالا کر رہے ہیں۔ اور
اُسی شان کے چھینٹے ساری دُنیا سے اُڑ کر شکنتلا پر پڑ رہے ہیں۔ اتنے
دنوں کی تکلیف اور بے عزتی آج کافور ہو گئی۔ وہ آج خوش تھی اس کا
سر پھر سے والدین کے گھر میں اُونچا تھا۔ اس کے خاوند نے اپنے
گُناہوں کا کفارہ کر لیا۔ اسی سے شکنتلا پھولے نہ سماتی
تھی۔

کفارہ کے بعد روشن بابو سماج میں مل گئے۔ دوستوں۔
رشتہ داروں اور براہمنوں نے روشن کے ساتھ بیٹھ کر آج پھر
کھانا کھایا

سسرال کی عورتوں نے داماد کو دیکھنے کے لئے زنانخانہ میں بُلایا۔

روشن مزے میں پان چباتے چباتے ہلتے ہوئے زمین تک لٹکتی ہوئی چادر اوڑھے اندر داخل ہوئے۔

کھانے کے بعد براہمن لوگوں کے دان دینے کا انتظام ہو رہا تھا اور براہمن لوگ برادری میں بیٹھے اپنا اپنا راگ ہانک رہے تھے۔ بوڑھے راجکمار بابو ذرا آرام کرنے کے خیال سے اُسی برادری میں بیٹھے اُن کی بحث سُن رہے تھے۔ اُسی وقت دربان نے آکر اُن کے ہاتھ میں ایک مُلاقاتی کارڈ دیا اور کہا "ایک میم صاحبہ آئی ہیں"۔

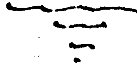
راجکمار چونک پڑے — کارڈ دیکھا — اس میں انگریزی میں لکھا تھا "مسز روشن بابو — یعنی روشن بابو سرکار کی بیوی"۔

راجکمار بابو بہت دیر تک حیرانی سے اس کارڈ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسی وقت ولایت سے آئی ہوئی۔ لال لال رُخسار والی سُنہرے بالوں والی۔ ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھوں والی۔ دُودھ کی طرح سفید رنگ والی۔ متوالی چال چلتی ہوئی۔ ایک انگریز دوشیزہ اس جگہ آ پہنچی۔ اور ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے پہچانے چہرہ کو نہ دیکھ سکی۔ اچانک ہی اس میم کو دیکھ کر سب کا بحث مباحثہ بند ہو گیا۔ برادری میں ایک سناٹا چھا گیا۔

عین اسی وقت روشن بابو چادر سے زمین صاف کرتے ہوئے وہاں

آپہنچے۔ اسی دم وہ انگریز لڑکی دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی۔ اور اُن کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ لگا دیے۔

اُس دن کے بعد برادری میں پھر کوئی بحث و مباحثہ نہ ہوا۔۔ مگر شکنتلا یاس کی آگ میں شب و روز جلنے لگی۔



شعلۂ تبسّم

افسانہ نمبر ۱۱

پھُول

اِس چھوٹے سے خوبصورت پھول کو توڑ لے۔ اور لے لے۔ دیر نہ کر! مجھے خوف ہے۔ کہ کہیں یہ مرجھا کر خاک پر نہ گر پڑے۔

تیرے ہار میں چاہے اُسے جگہ نہ مِلے۔ مگر اپنے پاؤں سے چھو کر اُس کی عزت کو بڑھا دے۔ اور توڑ لے۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں میرے آگاہ ہونے سے پیشتر ہی نذر کا وقت ختم نہ ہو جائے

بیشک اِس کا رنگ گہرا نہیں۔ اور اُس کی خوشبو بھی خاص تیز نہیں مگر پھر بھی اپنی پوجا کے لیئے اِس پھول کو اِستعمال کر۔ ابھی وقت ہے۔ اِسے توڑ لے

شعلۂ تبسّم

نریندر کی عُمر گو کم تھی۔ مگر پھر بھی اُس نے اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دُوسری شادی نہ کی۔ اس صدمہ کو بُھلانے اور اپنا دل بہلانے کے لئے شکار کرنے لگا۔ اس کا جسم سڈول تھا۔ تیز نگاہ تھی۔ کبھی نشانہ خطا نہ ہوا تھا۔ تھا تو بنگالی۔ مگر لباس پنجابیوں کا سا ہی پہنتا تھا۔ اس کے ساتھ پہلوان ہر نام سنگھ بلونت رائے اور گانے بجانے والوں اور بیکار لوگوں کا جمگھٹا لگا... رہتا تھا۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت سے ہر انسان بیزار تھا انہیں دنوں نریندر کا دوست مسٹر پرکاش ان کے ہاں تفریح کے لئے موجود ہوا

دو چار دنوں بعد وہ دونوں چند مصاحبوں کے ساتھ شکار کے لئے نکلے۔ دو کشتیوں میں ان کی رہائش کا انتظام تھا۔ نوکروں اور مصاحبوں کیلئے بھی تین کشتیاں تھیں۔ شام کے وقت ایک چھوٹے سے گاؤں کے کنارے کشتیاں روک لی گئیں۔ باورچیوں کو کھانا تیار کرنے کا حکم ہوا۔

صبح کا وقت تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر شکار کے لئے بندوقیں صاف کی جانے لگیں۔ دن بھر خوب شکار کیا۔ رات کو کھانے کے بعد گانا بجانا شروع ہوا۔ یہ سب لوگ تو عیش میں مست تھے۔ مگر اس گاؤں کی عورتوں کا پانی بھرنا اور نہانا تقریباً بند ہو گیا۔ لوگوں کی نیند حرام ہو رہی تھی۔

ایک دن صبح نریندرا اپنی کشتی میں بیٹھے اپنے ہاتھ سے دونالی بندوق درست کر رہے تھے۔ اسی وقت پاس ایک بطخ کی آواز سن کر آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ ایک لڑکی دو بطخوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے کنارے پر کھڑی تھی۔ ندی چونکہ چھوٹی تھی۔ اس لئے بہاؤ کچھ تیز نہ تھا۔ اور جگہ جگہ کئی قسم کے گھاس پیدا ہو گئے تھے۔ بطخیں کہیں دور نہ بہہ جائیں۔ لڑکی انہیں ہاتھ کے سہارے سے پکڑے ہوئے پانی میں تیرا رہی تھی۔

لڑکی کی عمر کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔ مگر جوانی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ چہرہ خوبصورت تھا۔ اور آنکھیں شرم و حیا سے پر تھیں۔ وہ اتنی سیدھی

تھی کہ اُسے معلوم تک نہ تھا۔ کہ وہ اب جوان ہے وُہ اپنی لڑکپن کی اداؤں میں ہی مست تھی۔۔ بالکل مدہوش۔

کچھ عرصہ کے لئے تو نریندر اپنی بندوق صاف کرنا بھُول گئے یہاں تک کہ اپنے کو بھُول گئے۔ ایسا حسین چہرہ ایسے چھوٹے سے گاؤں میں دیکھنے کو ملے گا۔ اس کا اُسے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ مگر کسی راج کی جگہ یہ دلربا چہرہ اسی کنارے پر اچھا معلوم ہوتا تھا۔ پھُول بجائے اس کے کہ سونے کے پھُولدان میں رکھا جائے۔ پودوں میں ہی خُوبصورت معلُوم پڑتا ہے۔ اس دن بادل گھرے ہوئے تھے۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ جس سے اُس لڑکی کی اوڑھنی سر سے گر ہی جاتی تھی۔ کنارے کا نظارہ قابلِ دید تھا۔ اور اس پر ایک بھولا چہرہ دیکھ کر نریندر حیران سا ہوگیا۔

یکایک وہ لڑکی ڈر کر اپنی بطخوں کو بغل میں دبا کر اُٹھی۔ نامعلوم کیا بڑبڑاتی ہوئی کنارے سے چلدی۔ یہ دیکھ کر نریندر اس کے اس طرح بھاگنے کا سبب معلوم کرنے کے لئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دیکھا کہ تیسری کشتی پر ایک مصاحب اپنی بندوق کو اس لڑکی کی طرف کر کے اس کو ڈرا رہا ہے۔ نریندر نے پیچھے جا کر بندوق چھین لی۔ اور اُسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ اچانک رنگ میں بھنگ دیکھ کر وہ مصاحب اندر چلا گیا۔ نریندر پھر اپنی کشتی پر آیا اور بندوق دُرست کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد نریندر نے ایک کبوتر کو گولی ماری۔ جو کچھ دُور جا کر گرا۔ شکار کی تلاش میں اس چھوٹے سے گاؤں میں گیا۔ مگر اُسے زیادہ حیران نہ ہونا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گھر کے باہر بڑ کے درخت کے نیچے وہی لڑکی اس زخمی کبوتر کو گود میں لئے رُوئی کے پھاہا سے پانی پلا رہی ہے۔ اور پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی ہے۔ اس کی پالتو بلّی بھی کبُوتر کو دیکھ کر اس کا شکار کرنا چاہتی ہے۔ مگر لڑکی کے ڈر سے اتنا حوصلہ نہیں کرتی۔ کہ اس کی گود سے کبُوتر کو جھپٹ لے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دُھوپ اور چھایا اس پیڑ کی گھنی شاخوں سے چھن چھن کر اس لڑکی پر پڑ رہی تھیں۔ پاس ایک گائے بیٹھی جُگالی کر رہی تھی اور یہ لڑکی جو صبح ندی کے کنارے ایک جنگل کی رانی معلوم دیتی تھی۔ مگر اسی وقت وہ ایک گھریلو دیوی سی دیکھ پڑتی تھی۔ نریندر ہاتھ میں بندوق لئے اس کے سامنے آیا۔ وہ بہت شرمندہ تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ کس طرح ثابت کیا جائے۔ کہ کبُوتر اس کی گولی سے زخمی نہیں ہوا۔ وہ ابھی یہ سوچ رہا تھا۔ کہ گھر کے اندر سے کسی نے پکارا۔ نرملا! لڑکی چونک اُٹھی۔ پھر کسی نے پکارا۔ نرملا۔ تب وہ جلدی سے اُٹھی۔ کبُوتر کے ساتھ گھر کے اندر چلی گئی۔ نریندر نے اپنے دل میں کہا ——

نام تو بہت ٹھیک ہے —— نرملا!

نریندر کشتی پر پہنچا۔ بندوق رکھ کر پھر اُسی گھر کے در پر چلا گیا۔ دیکھا ایک چبوترے پر بیٹھا ایک براہمن سر منڈوائے مالا جپ رہا ہے۔
اس کے چہرہ سے ایشور بھگتی ٹپک رہی تھی۔ نریندر نے براہمن کو نمسکار کر کے کہا" پیاس لگی ہے مہاراج! ایک لوٹا پانی کا مل سکتا ہے؟" براہمن نے عزت سے ایک جگہ بٹھلایا۔ اور پھر اُٹھ کر اندر گیا۔ اور ایک لوٹا پانی اور کچھ بتاشے لے کر باہر آیا۔ اور نریندر کے سامنے رکھ دیا۔

نریندر کے پانی پی چکنے کے بعد براہمن نے اس کا نام پُوچھا۔ نریندر نے اپنا نام بتلا کر کہا" مہاراج! اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو۔ تو بلاتامل مجھ سے کہئے گا۔"

اُس براہمن کا نام کاشی رام جوشی تھا۔ اُس نے کہا" بیٹا! تم میری کیا خدمت کر سکو گے؟ نرملا نام کی میری ایک لڑکی ہے۔ اس کی کسی اچھے لڑکے سے شادی کر کے مَیں اس کام سے سبکدوش ہونا چاہتا ہُوں ــــ نزدیکی گاؤں میں تو کوئی اچھے خاندان کا شریف لڑکا ملتا نہیں۔ اور دُور جانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ گھر میں بھگوان کرشن کی مُورتی ہے۔ اُسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا۔"

"اگر آپ میری کشتی پر چلیں۔ تو ایک خاندانی لڑکا بتلا سکتا ہوں۔"

ادھر نریندر نے کشتی پر آتے ہی اپنے آدمیوں کو گاؤں میں بھیجا۔ تاکہ وہ نرملا کے چال چلن کے متعلق کچھ دریافت کر سکیں۔ گاؤں میں جس سے بھی نرملا کا ذکر آیا۔ سب نے اس کی خوبیاں بیان کیں۔

دُوسرے دن کانشی رام جب کشتی پر آیا۔ تو نریندر نے اسے بڑی عزت سے اپنی بغل کی کُرسی پر بٹھلایا۔ اور باتوں ہی باتوں میں ظاہر کر دیا۔ کہ وہ خود ہی اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کانشی رام یہ سُن کر پہلے تو اچنبھے میں آ گیا۔ پھر خیال کیا۔ کہ شاید نریندر کو نرملا کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اُس نے حیرانی سے پُوچھا "تم میری لڑکی سے شادی کرو گے؟"

نریندر نے جواب دیا۔ "اگر آپ کو کچھ اعتراض نہ ہو۔ تو مَیں تیار ہوں۔"

کانشی نے پھر پُوچھا "نرملا کے ساتھ؟"

"جی ہاں"۔

"کانشی رام نے سنجیدگی سے کہا "تم نے ابھی اسے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟"

جیسے نرملا کو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ ایسا مُنہ بنا کر کہا "آپ اس کا کوئی فکر نہ کریں۔"

کانسی رام خوش ہو کر بولا "میری نرملا بہت ہی نیک لڑکی ہے۔ گھر کے کام کاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ تم جیسے بغیر اسے دیکھے ہی شادی کے لئے تیار ہو۔ میں بھی دعا کرتا ہوں کہ میری نرملا ہمیشہ تمہارے حکم کے مطابق چلے"۔

آیندہ جنوری میں شادی ہونا مقرر ہو گیا۔ گاؤں کے زمیندار بابو کلیان چند کے پرانے گھر میں شادی کا انتظام کیا گیا۔ وقت پر نریندر باجے گاجے کے ساتھ آ گیا۔

شادی کے وقت مانگ میں سندھور لگانے کی رسم کے وقت نریندر نے نرملا کی طرف دیکھا۔ مگر سر جھکائے شرم وحیا کی پتلی نرملا کا چہرہ نریندر نہ دیکھ سکا۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

خاندانی رسم کے مطابق نریندر۔ نرملا کو کھانا کھلانے کے لئے گیا۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں نے زبردستی اس سے نرملا کا گھونگٹ اٹھوا دیا۔ گھونگٹ اٹھتے ہی نریندر چونک اٹھا۔

یہ تو وہ لڑکی نہیں ہے۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ لڑکی بھی اس کے خیالات کو بھانپ گئی۔ نریندر نے پہلی عورت کے مرنے کے بعد شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ قسمت نے اس کی قسم کو اس طرح

کی دل لگی کر کے چٹکی بھر میں برباد کر دیا۔ کتنے ہی خاندانی رشتے آئے۔ مگر نریندر نے سب نامنظور کر دیئے۔ بڑے گھرانے کا خیال۔ دولت کا لالچ نریندر کو اس کی قسم سے نہ گرا سکا۔ لیکن آخر ایک کنگال براہمن کی لڑکی سے شادی کر کے وہ دُنیا کو کیا منہ دکھلائے گا۔ پہلے سُسر کے اُوپر غصّہ آیا۔ کہ بدمعاش نے دُوسری لڑکی دکھلا کر مجھے پھانس لیا۔ لیکن پھر سوچا کہ اس نے تو لڑکی نہیں دکھلائی۔ بلکہ وہ تو لڑکی دیکھنے پر زور دے رہا تھا۔ مگر میں نے ہی نہ کر دی تھی۔ اپنی غلطی کو کسی پر نہ ظاہر کرنا ہی ٹھیک سمجھ کر وُہ چپ رہا۔

وُہ کڑوی دوائی کی طرح اس بات کو پی گئے۔ مگر ان کا چہرہ یہ راز چھپا نہ سکا۔ سُسرال کی عورتوں کی ہنسی مذاق اسے بُرا معلوم ہونے لگا۔ اپنے اوپر وہ بہت رنجیدہ تھا۔ اسی وقت نریندر کے پاس بیٹھی ہوئی بہو چونک اُٹھی۔ اچانک ہی اس کے پاس سے ایک خرگوش نکل بھاگا۔ اسی دم اس دن والی لڑکی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔ خرگوش کو پکڑ کر اس کے رُخسار پر رخسار رکھ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ ''وہ پگلی آگئی'' کہہ کر سب عورتیں اُسے اشارہ سے چلے جانے کو کہنے لگیں۔ لیکن وہ ادھر دھیان نہ دے کر بہو کے پاس بیٹھ کر بڑی حیرانی سے دیکھنے لگی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایک عورت نے اُسے زبردستی پکڑ کر وہاں سے

ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ نریندر نے کہا: "اسے بیٹھی رہنے دو۔" اس کے بعد نریندر نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

کچھ جواب نہ دے کر وہ لڑکی نریندر کی طرف دیکھنے لگی۔ سب عورتیں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ نریندر نے پھر کہا "تمہاری بطخیں تو اچھی ہیں؟"

وہ لڑکی بغیر کوئی جواب دیئے۔ نریندر کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

نریندر نے حوصلہ کر کے پوچھا۔ "تمہارا وہ کبوتر اچھا ہو گیا؟" مگر پھر بھی کچھ جواب نہ ملا۔ سب عورتیں اس طرح ہنسنے لگیں۔ جیسے دولہا کو سخت دھوکا ہوا ہو۔

آخر کار نریندر کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لڑکی بہری اور گونگی ہے۔ گاؤں کے سب چرند پرند ہی اس کے ساتھی ہیں۔ اس دن نرملا کی پکار سن کر وہ اندر چلی گئی تھی تو وہ اس کا اندازہ ہی تھا۔ یہ سن کر نریندر چونک پڑے۔ جس کو نہ پا کر وہ اتنا اداس اور فکر مند تھا۔ تقدیر نے اسی کے ہاتھ سے جھٹکا سا پا کر اپنے کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔ نریندر دل میں سوچنے لگا کہ اگر میں اسی لڑکی کے باپ سے ملتا۔ اور میری خواہش کے مطابق اس لڑکی کی شادی میرے ساتھ کر دیتا تو؟ جب تک نریندر کے دل میں اس لڑکی کا خیال رہا۔ تب تک وہ اپنی عورت کی طرف سے لاپرواہ سا تھا۔ مگر جب اس لڑکی کو گونگا اور بہرہ پایا۔ تب تو ان کی آنکھوں سے

سیاہ پردہ الگ ہو گیا۔ نریندر نے ایشور کا شکریہ ادا کیا۔ اور موقعہ پاکر اپنی عورت کی دیکھا۔ اس کو اپنی نئی عورت لکشمی سے بڑھ کر خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ اتنی دیر کے بعد انہوں نے سمجھا کہ کانتی رام کی دعا رائیگاں نہ جائے گی۔ کیونکہ اب اُن کا شعلہ دل اپنی بیوی کے نورفشاں چہرے سے سرد ہو چکا تھا۔ اور "شعلہ تبسم" سے منور۔

شعلۂ بغض

افسانہ نمبر ۱۲

نذرِ نغمہ

میں زندگی بھر اپنے نغموں کے ذریعہ تجھے تلاش کرتا رہا ہوں۔ یہ گیت ہی مجھے در در پھراتے ہیں۔ میں نے اپنے اور دنیا کے بارے میں جو تجربہ حاصل کیا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تو ہر جگہ ہے۔ یہ نتیجہ صرف اُن نغموں کی بدولت ہے۔

میں نے جو کچھ سیکھا ہے۔ وہ بھی انہیں کی وجہ سے۔ انہوں نے مجھے پوشیدہ راستہ بتایا ہے۔ انہی گیتوں سے آسمانِ دل پر سینکڑوں ستارے جگمگا رہے ہیں۔

جو ہمیشہ مجھے راستہ دکھاتے رہے اور غم و رنج کے راز آشکار کرتے رہے۔ اور اس آخری وقت میں جبکہ شام کا اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ کسی شاہی محل کے دروازے پر مجھے لا کھڑا کیا ہے۔

شعلۂ بغض

موسم سرما عین شباب پر تھا۔ پورنماشی کا چاند اپنی پوری طاقت سے روشن تھا۔ حسینانِ جہاں چاند کو دیکھ کر مارے شرم کے آب آب ہو ہو رہے تھے۔ موسم بہار کی وجہ سے پھولوں کا بازار گرم تھا۔ جس طرف بھی آنکھ جاتی تھی۔ گلوں میں چھپ کر اپنے آپ کو کھو جاتی تھی۔ ہوا گاؤں کو سبزوں سے لگا لگا کر ان سے پریم کر خوشبو کو بھراتی تھی۔ اور پھر لوگوں کو سونگھا کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر رہی تھی۔ چکوی اپنے پیارے چکوے کے دیوگ میں پانی کے کنارے بیٹھ کر اس طرز سے نالہ کر رہی تھی کہ اس کی درد بھری صدا نوجوانوں کے دلوں میں بھی فراق کی آگ

پیدا کر رہی تھی۔ اور ماہئی بے آب کی طرح نرم نرم گدیلوں سے باہر تڑپ رہی تھی۔

شیام اپنے نرم نرم ہاتھوں سے کالے کالے گیسوؤں کو جو پُشپا کے چاند جیسے بے داغ چہرے کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہٹاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی پیاری پیاری چوڑیوں کو اس کے نازک بدن کو پے در پے بوسہ بوسہ دیتا۔ اس سے ایک خوش کُن آواز پیدا ہوتی جس سے دونوں کے دلوں میں ایک مسرت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ کبھی کبھی پُشپا کے بے نظیر تارج کو جو کہ دُنیا بھر کے خوبصورت پھولوں سے بنا ہوا تھا۔ دل لگی کا سامان بناتا۔ اس کو چومتا۔ اور نسیم سحر کی طرح اس سے بے ساختہ ہنسی مذاق کرتا۔ پُشپا کو ہنساتا۔ اور خود کبھی کبھی اُس کو بغل میں لے کر خوب زور سے دباتا۔ تاکہ مارے درد کے وہ تڑپ اُٹھے۔

مگر پُشپا خوبصورت بُت کی مانند بیٹھی ہوئی نیم برہنہ کھڑکی سے قدرتی نظارے دیکھنے میں اس قدر مشغول تھی کہ اس کو اپنے تن بدن کی بھی ہوش نہ تھی۔ اس کو اتنا بھی معلوم نہ تھا۔ کہ اس کا پیارا شوہر اس کے پیارے پیارے چاند نما چہرے کو دیکھنے میں محو ہے۔ یا اس کے ساتھ وہ پریم کی دُنیا میں جانا چاہتا ہے۔

پُشپا کو اس محویت کی حالت میں پا کر شیام بحرِ بیکراں میں غوطہ زن

اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے اس کے شانوں کو پورے زور سے دبایا اور کہا۔

"پشپا! پشپا!! خیال کس طرف ہے۔ جو اپنے آپ کو بھی عالمِ وجود سے باہر لے گئی ہو۔ کہ اگر تم کو خیال کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ایک خاکی ذرّہ سے کوئی وقعت نہ پاؤ...... آؤ میرے تڑپتے دل کو راحت پہنچا دو۔ پھونکنی کی طرح بجنے والے کلیجے کو ذرا ٹھنڈک پہنچاؤ۔ پشپا میں سچ کہتا ہوں کہ چاند کی چاندنی بھی تیرے بے نقاب حسن کے آگے ماند ہے......"

پشپا نے اس کو احسان مندانہ نظر سے دیکھا۔ گویا کہ اس کو مجسمۂ تصویر بنا دیا۔ اور آخرکار زبان کو جنبش دی۔ "پیارے ایشور۔ میرے بھگوان آپ کی کرپا درشٹی سے آپ کی داسی ایک ایسا جادو جانتی ہے۔ اگر اس کو عمل میں لایا جاوے۔ تو اس کے زیرِ اثر یہ تمام دل کش نظارے دل فریب حسن۔ چاندنی چوری نسیمِ سحر کا چلنا وغیرہ فوراً ہی حرفِ غلط کی طرح سب کچھ آنِ واحد میں مٹ جائیں۔"

"پیاری اگر تم کوئی ایسا ہی جادو جانتی ہو۔ تو پرماتما کے واسطے اس کو اس وقت عمل میں نہ لانا۔ ہاں اگر تم کو کوئی ایسا جادو وغیرہ آتا ہو۔ جس سے ایک ماہ میں چار اتوار کی بجائے دس بارہ اتوار آجائیں۔

یا یہ شب اتنی لمبی ہو جائے ۔ جتنی کہ تین دن اور رات ملنے سے ہوتی ہے ۔ تو بے شک اس جادو کو بہت جلدی پڑھو ۔

یہ کہنے کے بعد شیام نے اپنے سڈول بازوؤں سے پشپا کو اپنی آغوش میں کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس نے محبّت کا وہ علم پڑھا جس سے شیام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا ۔ تو ادھر پشپا فتحمندانہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے یُوں کہنے لگی ۔

"پران ناتھ مَیں چاہتی ہُوں کہ اس پوشیدہ اسرار کو آپ پر روز روشن کی طرح صاف صاف ظاہر کر دُوں ۔ جس کو مَیں نے مدّت سے دل کی تہ میں آہنی قفل سے بند کر رکھا ہے ۔ اور اس کو بستر مرگ پر ہی بتلانے کا ارادہ کر رکھا تھا ۔ مگر آج مَیں اس کو آپ پر ظاہر کرتی ہوں ۔ کیونکہ مَیں نے اپنے آپ کو ان مصیبتوں ۔ دُکھوں ۔ غموں کے لئے مضبوط کر لیا ہے ۔ جس کے بیان سے . . . ان کا سامنا کرنا ہوگا ۔"

شیام کی دلی آرزو یہی تھی کہ ہنس کر اس کہانی کا خاتمہ کر ڈالوں ۔ اور پشپا کو ساتھ لے کر دُنیا . . . . اور دُنیا والوں کی نظر سے بہت دُور . . . . . پریم کی دُنیا میں چلا جاؤں ۔ اور پھر . . . . . وہ خیالی دُنیا کی تمہید بنا رہا تھا ۔ کہ باہر سے کسی کے آنے کی آواز نے اس کی تمام تاروں کو توڑ پھوڑ کر اُس دُنیا کو خاکستر کر دیا ۔ یہ اس کے بزرگوار والد صاحب

ہر گوبند رائے تھے۔ جو کہ آندھی کی طرح ان کے آرام گاہ کی طرف تشریف لا رہے تھے۔ ان کی آمد نے دونوں پر سکتہ کا عالم کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو مایوس نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں ہر گوبند رائے کمرے کے نزدیک آئے۔ اور کڑک کر بولے ......" شیام !! میں حکم دیتا ہوں کہ تم اس خوبصورت ناگنی سے فوراً ہی خود کو الگ کر دو۔ تاکہ اس کے زہریلے اثر سے سارا خاندان ملیامیٹ نہ ہو جائے"۔

شیام نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظر کی۔ تو اس کی شانتی۔ پورن شانتی روپ میں پایا۔ وہاں پر غم و الم کے کوئی نشان نہ دیکھے۔ مگر اس کے دل کے پردوں سے نکل کر ایک سرد آہ نے لب داستاں کا بوسہ لیا۔ اور آس پاس کے ہمجولیوں پر برفانی سردی کا اثر پیدا کیا پھر خوبصورت مجسم تصویر کی طرح دیوار کی مدد سے بیٹھ گئی۔

پپیہے کے کانوں کے پردوں کو پھاڑنے والی بلند آواز "پی کہاں۔ پی کہاں"۔ بدستور جاری تھی۔ نسیم سحری بدستور چل رہی تھی۔ چاند بھی ویسا ہی روشن تھا۔ تمام قدرتی منظر ویسے کے ویسے ہی تھے۔ مگر اب ان کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دونوں کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ دونوں تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کافی کوسوں پڑے ہوئے الگ الگ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔

(۲)

شیام نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سخت بے قراری کے ساتھ دریافت کیا۔ "کیا یہ سب جھوٹ نہیں؟"

"نہیں۔ بلکہ سچ ہے"۔ پشپا نے سر کو نیچے کرتے ہوئے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔

"افسوس کہ تم نے اس سے پہلے کبھی بھی کچھ نہ بتلایا۔"

"میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے ہرچند کوشش کی۔ اپنی ہمت کو کام میں لائی۔ مگر لبوں نے کبھی بھی ساتھ نہ دیا۔ جس کی وجہ سے میں ہمیشہ ہی بتلانے میں ناکامیاب ہوتی رہی...... آہ! میں ایک خوفناک پُراسرار عورت ہوں"۔

"پشپا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم سے تمام داستان سُن لُوں واجب ہے تم بھی حرف بحرف بتلا دو۔"

پشپا نے آہستہ آہستہ دل کی تاروں کو ٹھیک کیا اور پھر نرم نرم آواز سے بجانے لگی۔ اس کی عجیب رکتی ہوئی آواز میں...... ایک خاص درد تھا۔ جس درد کی وہ تاب نہ لا سکی...... اس کا نازک بدن چنتا کی چتا پر جل رہا تھا۔ جس کا دھواں اس کی نرگسی آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دل لوہار کی پھونکنی کی طرح بج

رہا تھا۔ مگر شیام نے اس کی درد بھری داستان کو سُنا۔ ایک سرد آہ کھینچ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ پُشپا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ کہ اس کی دنیا ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی ہے۔ سُہاگ کا سماں خواب و خیال ہو گیا ہے۔ مگر اس کے چہرے سے یہ ثابت ہو رہا تھا۔ کہ وُہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے۔ اور تمام مصیبتوں کو معمُولی سمجھ کر مردانہ وار مقابلے کے لئے ڈٹ گئی ہے۔ اور ان باتوں کو معمولی خیال کر رہی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کو پتی کی گذشتہ محبّت بے چین کر دیتی ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو پتی سے کوسوں دُور دیکھتی ہے۔ محبّت کی دُنیا کو زیر و زبر دیکھتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتی اور تصوّر کرتی کہ کس طرح میرا پتی میرے ساتھ پریم و الفت سے پیش آتا تھا۔ درد بھری باتوں سے میرے دل کی دُنیا میں آرام و سکون کو تلاش کرتا تھا۔ جب مَیں اس کی پریم بھری باتوں میں آکر ہنستی تھی۔ تو اس کی زندگی کا باغیچہ از سر نو سر سبز و شاداب نظر آتا تھا۔ قدم قدم سے خوشی و مسرّت ٹپکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجھ ذلیل عورت میں جذب کر دینا چاہتا تھا۔ مگر آہ وہی اب مجھ سے کوسوں دُور بھاگ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ کو ایک بوجھ محسوس کر رہا ہے۔ خوشی کی جگہ غموں کے سمندر میں غوطہ زن ہو رہا ہے۔ آہ! کیا محبّت یہی ہوتی ہے۔ کہ مذہب کی ایک ہلکی سی چوٹ سے محبّت کی دُنیا اُجڑ جائے۔ کیا محبّت ایک ایسی

کھانے والی چیز ہے۔ جس کو مذہب کا مُنہ بہت جلدی نگل جاتا ہے۔ اور کھانے کے بعد ڈکار بھی نہیں لیتا۔ کیا محبّت ایک ستار کی مانند ہے۔ جو مذہب کی ایک ہی چوٹ سے درہم برہم ہو کر ٹوٹ جائے۔ آہ! یہ محبّت نہیں۔ بلکہ محض مطلب براری ہے۔ محبّت! سچی محبت!! جس کو دُنیا بھر کی طاقتیں بھی نیست و نابود نہیں کر سکتیں۔ ملک الموت کا فرشتہ بھی سچی موت کو نہیں مار سکتا۔ جب تک دُنیا قائم ہے۔ محبّت قائم رہے گی۔ محبت وُہ چنگاری ہے۔ جس سے تمام مکان جل کر تباہ و برباد ہو جانے کے بعد بھی اس کی راکھ میں موجود رہتی ہے۔ تو پھر میں دیکھوں گی ایک مذہب کیا تمام مذہب بھی محبّت کی تار نہیں توڑ سکتے۔ ہم دونوں کو الگ الگ کر سکتے ہیں۔ مگر پریم کی دُنیا میں اکٹھے ہی رہیں گے۔

اُف۔۔۔۔آہ۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر ہوئی۔ کہ اس کے پیارے پتی نے یہ کہا تھا۔ "رات۔ خوبصورت رات کو بڑھا دو"۔ مگر قدرت نے رات میں اضافہ کیا کہ گذرنے میں نہ آتی تھی۔ پپیہا کی تڑپا دینے والی آواز پی کہاں۔ پی کہاں"۔ اس زخم خوردہ دل پر نمک پاشی کا کام کر رہی تھی۔ وُہ ہلکی ہلکی نسیم سحر جو پہلے بہت خوش کن محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس کے دل کے تاروں کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینے کے درپے تھی۔ چاندنی کی چاندنی اس کو اب سُلگتے ہُوئے چنگارے معلوم ہوتے تھے۔ اور خود کو ان پر تڑپتی

محسوس کر رہی تھی۔

(۱۸)

تمام شب شیام نے آنکھوں میں گذاری۔ جب صبح کے پرندے نے ملکۂ شب کو بھاگنے کا پیغام دیا۔ تو اس کی جان میں جان آئی لباس کو تبدیل کر کے سیدھا تیر کی طرح "اندرسین" کے عشرت کدہ پر گیا! اندرسین نے پریم سے کہا:۔

"شیام تمہارے رخِ انور پر غمی کے بادلوں نے کیوں مورچہ لگا رکھا ہے؟"

"اب یہی بادل تم پر برسیں گے۔ پانی کی بجائے پتھر کی صورت میں۔ کیونکہ تم نے ہماری برادری کو برباد کر دیا ہے۔ اور ہمارے خاندان کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا ہے۔ مجھ کو نرک کنڈ میں دھکیل دیا۔ اب تمہیں اسکا پھل بھگتنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ سب تمہاری ذات سے ہوا ہے۔ بس اب تیار ہو جاؤ"۔ جوش سے شیام نے کہا:۔

"میں آپ کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ کہ تم نے ہم کو اپنے سینے سے لگا کر پاک وصاف کیا۔ اور میرے خاندان کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ ثابت ہوئے۔ . . . . کیا یہ سچ نہیں ہے"۔ اندرسین نے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔

کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میری خاطر آپ کو کوئی تکلیف ہوئی۔ یا خاص مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بلکہ میرا تو یہاں تک خیال ہے۔ کہ میں تو آپ کو باپ کی طرح مانتا تھا۔" شیام نے آواز کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"شیام۔ ان باتوں کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے میں ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کا جواب دینے کے بعد آپ ہر طرح کے جواب مجھ سے دریافت کریں گے۔" اندر سین نے غم سے پُر درد آواز میں کہا۔

"میں آپ کی بات کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ بخوشی دریافت کریں۔"

"آہ! میری نیک سیرت لڑکی۔ دیوتاؤں جیسی خصلت رکھنے والی۔ لڑکی نے اپنے باپ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت تیری عمر۔۔۔۔۔۔ بہت ہی چھوٹی تھی جس کی وجہ سے تم کو تمام حالات سے آگاہی نہیں ہے۔ اب ذرا حوصلہ کر کے سنو۔ جو کچھ میں کہونگا۔ اس کو بخوشی سنو۔"

"ہاں۔ ہاں۔ سناؤ۔ میں بخوشی سنوں گا۔" شیام نے جواب میں کہا۔

"اچھا۔ اب بغور سنو۔ اس وقت تمہاری عمر بہت تھوڑی تھی جبکہ میرے داماد نے میری اکلوتی لڑکی کے تمام زیورات وغیرہ کو اپنے قبضے میں

کرکے اس کو زبردستی میرے گھر میں بھیجدیا۔ اور خود چوروں کی طرح انگلستان
چلا گیا۔ شیام۔ پیارے شیام۔ اب تم جوان ہو۔ عقلمند ہو۔ اب اندازہ
لگاؤ۔ کہ اس وقت میری اور میری لڑکی کی حالت کیا ہوگی۔ ہم دونوں
قہر درویش برجان درویش تھے۔ خدا کا شکر کرتے کرتے پانچ سال گذرے۔
تو وہ بھی بیرسٹر بن کر واپس آگئے۔ اس وقت تم کلکتہ تعلیم حاصل کر رہے
تھے۔ اس وقت تمہارے بزرگوار والد صاحب نے تمام برادری کو اکٹھے
کرکے خود ان کے سرکردہ لیڈر بن گئے۔ اور ان سے عہد و پیام لے لیا۔
کہ اگر میں اپنی لڑکی بیرسٹر صاحب کے ہاں بھیجدوں تو وہ تمام کے تمام میرا
حقّہ پانی بند کر دینگے۔ اور برادری سے خارج کر دینگے۔ مجھے جب ان باتوں
کا پتہ لگا۔ تو میں نے تمہارے باپ کے پاس ہر چند منت سماجت کی مگر
لاحاصل۔ آخر کار پاؤں پہ سر رکھ کر اتنا رویا کہ جتنا میرے سر میں پانی
تھا۔ مگر بے فائدہ۔ اور کسی صورت میں بھی نہ مانے۔ میں نے ہر چند
کوشش کی اور کہا کہ میں اس لڑکے کو پنڈتوں سے شدھ کرا لیتا ہوں۔
آپ جو سزا دیں۔ میں اس کو برداشت کر لیتا ہوں۔ مگر وہ نہ مانے۔ وہ
اپنی ضد پر بدستور قائم رہے۔ آخر کار میں نے کہا۔ کہ آپ میری اور میری
لڑکی کی عمر تباہ نہ کریں۔ میرا خاندان صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح
مٹ جائے گا۔ آپ رحم کریں۔ مگر وہاں پہ رحم کہاں۔ انہوں نے

زبردستی سے کام لیا۔ اور مجھے ٹھوکریں مار کر باہر نکال دیا۔ میں وہاں سے روتا ہوا گھر آیا۔ قوم اور گاؤں کو آخری نگاہ سے دیکھا۔ اور حسرت بھری نظروں سے قوم اور گاؤں کو چھوڑ دیا۔ خود کلکتہ چلا گیا۔ مگر آنحضرت پھر بھی میرے سایہ کی طرح میرے ہمرکاب رہے۔ اور طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کراتے رہے۔ حتیٰ کہ میرے لڑکے کی منگنی ہوگئی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہوگئیں۔ صرف دو تین دن کا وقفہ تھا کہ تمہارے مہربان والد صاحب نے لڑکی والوں کو کہہ سُن کر رشتہ منسوخ کرا دیا۔ پیارے شیام۔ اب تم ہی ان حالات کا پتہ لگا لو۔ کہ میرے دل پر کس قدر صدمہ ہوا۔ لیکن ابھی سُنتے جاؤ۔ ابھی ابتدا ہے۔ بہت ہی دلکش دلفریب داستان ہے سُنو

جس وقت تم کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس وقت ایک متمول آدمی راجکمار تمہارے مکان کے ساتھ والے مکان میں باقی ماندہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اب اس جہانِ فانی سے کُوچ کر گیا ہے اسکی زندگی کا سرمایہ صرف ایک معصوم بیوہ لڑکی پشپا رہتی تھی۔ جو کہ ایک بہت ہی تنگدست غریب درزی کی نشانی تھی۔ لڑکی حسن میں لاثانی تھی۔ اس کے آگے چاند کی روشنی ماند تھی۔ اس کے حُسن کا تذکرہ جگہ بہ جگہ ہوتا تھا۔ اس بوڑھے برہمن کو ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح

سے پُشپا کو کالج کے عیش پرست طالب علموں سے بچاؤں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ کسی کی محبت میں پھنس کر تمام خاندان کو کلنک کا ٹیکہ لگائے۔ اور خود طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرے۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اپنے جذبات کو کہاں تک پوشیدہ رکھ سکتی ہے۔ اور اپنے دل کے ارمانوں کو دبا سکتی ہے۔ اس نے اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے مکان کی چھت پر کسی نہ کسی بہانے سے چلی جاتی تھی۔ اور کوشش کرکے اپنے مہربان کو ڈھونڈ لیتی تھی۔ میرا یہاں تک خیال ہے کہ اس کے پرستار تم ہی تھے۔ کیونکہ ان دنوں تم کو بھی پڑھنے کا از حد شوق تھا اور وہ شوق عموماً مکان کی دوہری چھت پر پورا ہوتا تھا۔ ادھر وہ بھی اوپر جاتی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تم دونوں میں باہمی گفتگو ہوئی یا نہیں۔ مگر یہاں تک تو ضرور ہوا۔ کہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کے خواہشمند ہونے لگے۔ اور راہِ عشق کی منزل میں بڑھ بڑھ کر قدم مارنے لگے۔ مگر عزیزم شیام عشق۔ مُشک۔ کھانسی وغیرہ چھپانے سے نہیں چھپ سکتی۔ گو اس نے بوڑھے براہمن کو ہر چند دھوکا دیا۔ مگر پھر بھی اس پر ہر بات ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ وہ گھریلو کام میں غلطیاں پر غلطیاں کرنے لگی۔ دل گھر سے اُچاٹ ہو گیا۔ ہر وقت اُداس۔ غمگین رہنے لگی۔ جس سے صحت بھی بہت جلد بگڑ گئی۔ کبھی پیٹ درد کا بہانہ کرتی۔ کبھی

سے درد کا اور کبھی رو دھو کر دل کا غبار نکالتی۔ مگر اس بوڑھے برہمن کو اس محبت کے مرض کا بالکل پتہ نہ تھا۔

آخر کار وہ اس راز سے واقف ہو گیا کہ تم دونوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو پریم کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اور آنجناب کالج کو خیرباد کہہ کر زیادہ وقت چھت پر کتاب لے کر جا بیٹھتے ہیں۔ اور عشق کی کتاب کا مطالعہ کرتے۔ اور جو اس کے رُخ انور سے ظاہر ہوتا۔ اس کو ازبر کرتے۔ ایک دن تم دونوں سے تنگ آکر میرے پاس صلاح و مشورہ کے لئے آیا۔ اور آپ کی محبت بھری داستان شروع سے آخر تک حرف بحرف سُنا دی۔ مَیں نے جواب میں کہا "پنڈت جی عرصہ مدید سے آپ کی آرزو تھی۔ کہ کب سبکدوش ہوں اور کب بنارس کی یاترا کروں۔ اب وقت ٹھیک ہے۔ پانڈو بھی جاتے ہیں۔ اس لئے تم کل یا پرسوں یاترا کے لئے تیار ہو جاؤ۔ باقی رہی پُشپا۔ سو اس کو مَیں اپنی نگرانی میں رکھتا ہوں۔ اس کا آپ سے زیادہ محافظ ہوں گا۔ پنڈت جی کو میری صلاح پسند آئی۔ اور وہ بخوشی یاترا کے لئے چلا گیا۔ پھر میں نے اس لڑکی کو لے کر گدا دھر کے سُپرد کیا۔ اور عوام میں پُشپا اس کی لڑکی مشہور کر دی۔ ہر فرد و بشر کو یقین ہو گیا۔ کہ وُہ پنڈت گدا دھر کی لڑکی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ظہور پذیر

ہوا۔ اس سے تم کو اچھی طرح خبر ہے۔ پیارے شیام۔ اب تم پر ہر ایک بات ظاہر کردی ہے۔ جس سے میرے دل کا درد بھی کم ہو گیا ہے۔ دل کا غبار نکل گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک نہایت دلچسپ کہانی ہے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ اس کہانی کو لکھ کر چھپوا دیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ میری قلم میں طاقت نہیں۔ لوگوں کو خیال ہے کہ میرا فرزندِ ارجمند کہانی لکھنے میں یکتائے زمانہ ہے۔ سو اس کو سُن کر دِل بلیوں اُچھل پڑا اور دل میں خیال کیا۔ کہ اس سے اس کہانی کو لکھواؤں گا۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کروں گا۔ اگر تھوڑی سی مدد تم بھی دو۔ تاکہ سب مِل مِلا کر کہانی کو ختم کر دیں۔

شیام نے تمام باتوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا پتیا شادی پر جلد رضامند ہو گئی تھی؟"

اندرسین نے جواب دیا۔ "یہ بہت انوکھی بات ہے۔ کہ پرماتما سروشکتیمان نے عورتوں کے دلوں میں ایک خاص جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ جب وہ زبانِ مبارک سے "نہ" کہتی ہیں۔ تو ان کا مطلب "ہاں" سے ہوتا ہے۔ جب اس کو گدا گر دھر کے مکان میں لایا گیا۔ تو اس کی تمام حرکات و سکنات پاگلوں۔ دیوانوں جیسی ہو گئیں۔ لوگ اس کو پاگل کہنے لگے۔ پیارے شیام! لیکن وجہ یہ ہے۔ کہ اس کو

نظر نہ آنے تھے ۔ ادھر آپ بھی بے چین ہو گئے ۔ دیوانوں کی طرح
اس کی کھوج میں نکل پڑے ۔ مگر ایشور کی کرپا ہے کہ تم بہت جلدی
بہت جلدی کامیاب ہو گئے ۔ کیونکہ تم نے اس کو پا لیا تھا اور تم اپنا
کالج اس کی گلی میں بنا تے تھے ۔ ایک نیم برہنہ کھڑکی میں سے تم دونوں
ایک دُوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ۔ اور آہوں سے تمام
آسمان کو چھپا دیتے تھے ۔ چونکہ مجھ کو تم دونوں سے خاص الفت تھی ۔
جس کی وجہ سے تم دونوں کی تکلیف کو بر داشت نہ کر سکا ۔ تم کالج
کو ہمیشہ سے چھوڑ نے کا خیال کرتے تھے ۔ ادھر پُشپا بھی مریضِ عشق کی
طرح دن بدن کمزور اور دُبلی ہوتی جاتی تھی ۔ سو اس خیال کو مدِّ نظر رکھتے
ہوئے ایک دن پُشپا کو مَیں نے اپنے ہاں بُلایا ۔ اور بڑے پریم بھاو
سے بٹھلایا اور کافی باتوں کے بعد کہا کہ تو میری بیٹی ہے ۔ بیٹی کو باپ
سے شرم کیسی ۔ دُوسرے مَیں آپ بُوڑھا ہو گیا ہوں ۔ سو اس لئے اپنی
شرم کو بالائے طاق رکھ کر مَیں جو کچھ پُوچھوں اس کا جواب دیتی جاؤ ۔
پُشپا تم سُن کر حیران ہو گی ۔ کہ مَیں تمہارے چاہنے والے دلبر سے اچھی
طرح واقف ہوں ۔ دونوں کے حالات سے آگاہ ہو ا ۔ میری خواہش
ہے ۔ کہ تم دونوں کو ہمیشہ کے لئے اکٹھا کر دوں ۔ یعنی شادی کر دُوں ۔
جس سے دونوں کی زندگی بخوشی بسر ہو گی ۔ یہ بات سُن کر وہ بچوں

بچّوں کی طرح رونے لگی۔ اور بغیر کوئی جواب دیئے چپ چاپ چلی گئی۔
مَیں اس کی شرم کو محسوس کر کے رہ گیا۔ اس کے بعد میں اُ سے کئی بار
ملا۔ اور ہر بار آپ کی بابت بات کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی
شرم بھی دُور ہو گئی۔ اور مَیں نے اس سے وعدہ کیا۔ کہ تم رضا مند ہو
جاؤ۔ تو مَیں تمہاری شادی اس سے کر دُوں گا۔ تو پھر اس نے جواب
دیا۔ "یہ ناممکن بات ہے"۔ مَیں نے حوصلہ سے کہا۔ دُنیا میں ناممکن
بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کا تم کچھ فکر نہ کرو۔ مَیں اس کا اچھی
طرح انتظام کر دُوں گا۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ تمام گلی محلے میں تم ایک
برہمن کی لڑکی مشہور ہو گئی ہو۔ تو پھر فکر کس بات کا ہے۔ اس کے بعد بہت
لمبی چوڑی گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا کہ تمہاری خواہش کیا
ہے۔ سو مَیں نے جواباً کہا۔ بیٹی تم تو ایسی باتیں کرتی ہو۔ جیسے کہ مجھ کو
کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ مجھے ہر بات سے واقفیت ہے۔ وہ تو دیوانوں
کی طرح تمہارے گرد چکر لگایا کرتا ہے۔ پس ان باتوں کو جانے دو۔
اور چپ چاپ شادی کی رسم ادا ہو جانے دو۔ پچھلے ارمان مت
نکالو۔ جو کچھ ہوگا۔ اچھا ہی ہوگا۔ تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ اور شادی
ہو جانے دو۔ پھر کسی قسم کا خدشہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ راز تا قیامت تک
ظاہر نہ ہوگا۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس کا دلی مقصد شادی کرنے کا تھا یا نہیں لیکن جب کبھی میں کہتا کہ چھوڑو ان باتوں کو۔ تو اس کے چاند جیسے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتی جب غم کا بوجھ زیادہ ہو جاتا۔ تو اس کی آنکھیں اس کی مدد کرتیں۔ تو ساون بھادوں کی جھڑی بندھ جاتی۔ پھر اس کے بعد وہ مجسمۂ تصویر بن جایا کرتی تھی۔ جب میں نے اس سے ہر طرح کی تسلی کر لی۔ تو پنڈت گدادھر کو آپ کے باپ کے پاس بھیجا۔ معاملہ ظاہر کیا گیا اور تم دونوں بہت خوش ہوئے۔ اور بغیر کسی وجوہات کے شگن لینا منظور کر لیا۔ جس سے تمام بات ختم ہو گئی۔

جب وہ دن قریب آنے لگا۔ تو اس کی طرف سے بھی ضد کا سمندر موجزن ہونے لگا۔ اور اس کی ہر بات پکارتی تھی۔ میری شادی اس سے نہ کرو۔ اس شادی خانہ بربادی کو روک دو۔ جب میں نے اس کی ایسی باتیں سنیں۔ تو زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ حواس باختہ ہو گئے۔ میں نے ہر چند منت خوشامد بھی کی اور آخر کار رو دیا اور کہا۔ بیٹی! اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اس کا واپس آنا قطعی ناممکن ہے۔ اب جبکہ شادی کا دونوں طرف سے مکمل انتظام ہو چکا ہے۔ تو پھر کیسے بات بنے۔ تو اس کے جواب میں اس نے کہا۔ کہ لوگوں میں مشہور

کر دو کہ مَیں ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئی ہوں۔ تب مَیں نے کہا۔ کہ اگر بفرضِ محال یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دُوں کہ تم موت کی گود میں سو گئی ہو۔ تو پھر اس کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ اور وُہ اس مصیبت کو برداشت نہ کر سکے گا۔ جھٹ پٹ جان دے دیگا۔ اس کے بعد بھی تم اس کی ساتھی ہو گی۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ دو جانوں کا پاپ مَیں اپنے سر پر لوں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ پُشپا ایشور کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ اور اپنی ضد کو چھوڑ دو۔ ایشور تمہاری بھی لاج رکھے گا۔ کیونکہ وہ ہی سب کا مالک ہے۔
پشپا جو ہونے والا ہے۔ اس کو ہو جانے دو۔ مَیں تمہارا تازندگی احسان مند رہوں گا۔ میری تقریر نے جادُو کا اثر کیا۔ اور وہ ہار مان گئی۔

غرضیکہ تم دونوں کی شادی بڑی دھُوم دھام سے ہوگئی۔ غریب غرباء میں بہت زر و مال لوٹایا گیا۔ خیر ان تمام باتوں سے تم کو خبر ہے اب میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور مَیں خوش و خرّم رہنے اس کے بعد تم کو تمام باتیں یاد ہیں۔ جبکہ تم نے ایسا بڑا کام کیا۔ تو پھر تم خاموش کیوں نہ رہے .... کیوں خواہ مخواہ سوئی ہوئی بات کو ظاہر کیا؟"

اندرسین نے بڑے تسلی بخش لہجہ میں کہا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں تمہارے باپ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے کس طرح میری دل شکنی کی تھی۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جان بوجھ کر تمہاری شادی اس بیوہ سے کی گئی تھی۔ میرا فرض تھا۔ سو میں نے ادا کیا۔ اور تمہاری جاتی کے مان کو نشٹ کیا لیکن اب جبکہ تمہاری ہمشیرہ کی برات آنے والی تھی۔ تو میرے دل میں ایک خاص درد اُٹھا۔ جس کے درد سے میں سخت بے چین ہو گیا۔ کہ اب دُوسری جاتی کو خراب نہ کیا جائے۔ اور ان کے پاس جا کر کہا۔ کہ تم جس لڑکی کو بیاہ کر لاؤ گے۔ وہ لڑکی شوُدر ہے۔ اس کا ثبوت میرے پاس ہے۔ وقت آنے پر ثابت کر دُوں گا۔

شیام نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ” اب پُشپا کی زندگی کا کیا حشر ہوگا۔ کیونکہ میں نے اس کو گھر سے نکال دینا ہے۔ اس کی زندگی کس طرح بسر ہو گی؟“

اندرسین نے کہا ” اس کا جواب میں کیا دُوں۔ تمہارے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے۔ اب تم جانو یا وہ۔ مجھے اس سے کیا غرض“۔

شیام سے اب ضبط کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ اور سرد آہیں بھرتا ہوا اٹھا اور گھر واپس آیا۔ اندرسین نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اس کے

گھر ٹھہرے۔ مگر شیام نہ ٹھہرا۔ چلا ہی گیا۔

(۴)

ملکۂ شب اپنی کالی چادر چاروں طرف بچھا چکی تھی۔ جانوروں کو آرام و راحت کا پیغام دے چکی تھی۔ تالاب کے کنارے پر بڑے بڑے لیچی کے درخت سیاہ لباس پہنے ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔ ان کا سایہ بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ ہوا بھی بیوہ کی طرح سرد آہیں بھرتی ہوئی کسی کے غم میں شریک ہو رہی تھی۔ آج کالے آسمان پر بھی ستارے بہت بے چین نظر آرہے تھے۔ ان کو بھی کسی کا دُکھ محسوس ہو رہا تھا۔

ملکۂ شب نے اپنی تمام جگہوں پر سلطنت کا ڈنکہ بجا دیا تھا۔ اور در و دیوار اس کے زیرِ اثر تھے۔ شیام اس کھڑکی میں پہلے یہاں بیٹھا کرتا تھا۔ بستر پر پُر خاموشی لئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کی سرد آہ کبھی کبھی کمرے کی تاریکی کو سرد کر دیتی تھی۔ پشپا بھی بُت کی طرح فرشِ زمین پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے نازک نازک ہاتھ پران ناتھ کے چرنوں کو پکڑے ہوئے تھے اور آنکھوں سے گنگا جمنا رواں تھی۔ خاموشی ہی خاموشی طاری تھی۔ ہوا بھی ان کو دیکھ کر سہم گئی۔ اور ایک تاریک کونے میں جا بسی۔

باہر سے کسی کے آنے کی آواز آئی۔ یہ اُن کے پتا تھے۔ انہوں نے آتے ہی بلند آواز میں کہا "شیام! میرا حکمنامہ پانچ دن سے جاری ہو چکا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ تم نے اس کی بالکل تکمیل نہیں کی۔ پس اب سنبھل جاؤ۔ اور اس ناگنی کو جتنی جلدی ہو سکے گھر سے باہر نکال دو۔"

ان لفظوں کو سُن کر ان دونوں پہ سکتہ کا عالم طاری ہو گیا پُشپا نے دیوانوں کی طرح شیام کے چرنوں کو پکڑ لیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔

شیام اپنے آپ کو سنبھال باہر آیا۔ اور کہا۔

"میرے مہربان پتاجی۔ مَیں اب اس کو جُدا نہیں کر سکتا۔ یہ میری تھی۔ میری ہے اور میری۔۔۔ رہے گی"۔

اس کے پتا نے کڑک کر کہا۔

"کیا اپنے خاندان کو بدنام کر دگے۔ اس کا چراغ گُل کر دو گے؟"

شیام نے کہا۔ "محبت کے آگے یہ تمام ہیچ ہیں۔ مجھے ان باتوں کی کچھ پروا نہیں"۔

تب اسکے پتا نے کہا "تو جاؤ۔ مَیں تم کو گھر سے باہر نکال دیتا ہُوں۔ میرے ناخلف بیٹے۔ میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ"۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔ شیام ایک سرد آہ کے ساتھ مکان سے باہر ہو گیا ـــــ یہ ہے شعلۂ بغض!

شعلۂ دل

افسانہ نمبر ۱۳

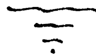
عرضِ مُدّعا

صرف اتنی خواہش ہے۔ کہ کچھ دیر کے لئے مجھے اپنے پاس بیٹھنے دے جو کام مجھے کرنے ہیں۔ انہیں پھر کرلوں گا۔

تجھ سے الگ ہو کر میرا قلب راحت و آرام سے بالکل بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ میرا کام محنت کے اتھاہ ساگر میں بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

آج میرے دریچہ میں سرد آہیں بھرتے ہوئے موسم بہار کا دیوتا داخل ہو رہا ہے۔ اور شہد کی مکھیاں شگفتہ پھولوں پر ایک عجیب راگ الاپ رہی ہیں

اب تیرے مقابل خاموش بیٹھ جاؤں۔ اور زندگی کا آخری گیت گاؤں۔



شعلۂ دل

مَیں اور میرا ایک دلی دوست ایک دن ریل میں بیٹھے ہوئے کلکتہ جا رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک آدمی سے مُلاقات ہوگئی۔ وہ مُسلمانی لباس میں تھا۔ اس کی باتیں سُن کر حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ دُنیا کی ہر بات کے سلسلے میں وہ اس طرح باتیں کرتا۔ جیسے ایشور پہلے اُسی سے مشورہ کر کے سب کام کرتا ہے۔ دُنیا میں جتنی بھی اچھی یا بُری سازشیں ہوتی ہیں جیسے رُوسیوں کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ۔ انگریزوں کی پوشیدہ چالیں۔ ان سب کے معاملہ میں کچھ بھی نہ جاننے کے سبب سے ہم لوگ اس کی باتوں پر یقین کرنے لگے۔ ہمارے نئے دوست نے

مُسکرا کر کہا "دُنیا میں جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ اُن کا ذکر تو آپ کے اخبار والے کر ہی نہیں سکتے"۔

گھر سے دُور جانے کا پہلا موقع تھا۔ ہم تو اس کی باتیں سُن کر سنّاٹے میں آ گئے۔ وہ آدمی بہت ہی عالم تھا۔ کبھی لیکچر دینے لگتا۔ تو کبھی فارسی کے شعر بولتا۔ لیکچر اور فارسی کے شعروں میں اپنا دخل نہ ہونے کے سبب ہم اس کی ہر بات کے زیرِ اثر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میرے دوست کے دل میں یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے نئے دوست ضرور کسی خاص سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس آدمی کی ہر معمولی بات کو بھی بڑے غور سے سُننے لگا تھا۔ اور کسی کسی بات کو اپنی پاکٹ بُک میں لکھتا جاتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست کی اس حرکت کو دیکھ کر وہ آدمی بہت ہی خوش ہے۔

گاڑی آ کر لکھنؤ جنکشن پہ ٹھہری۔ ہم لوگ دُوسری گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ راستہ میں انجن کی خرابی کی وجہ سے دُوسری گاڑی بہت دیر سے آئے گی۔ یہ سُن کر میں ٹیبل کے اوپر بستر بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ اُس آدمی نے یُوں کہنا شروع کیا نظامِ ریاست کے متعلق دو ایک باتوں میں اختلاف ہونے کے سبب سے جب میں ریاست جُوناگڑھ کا کام چھوڑ کر حیدر آباد کے نظام

کے ہاں نوکر ہو گیا۔ تب مجھے نوجوان اور مضبوط آدمی دیکھ کر بھڑوچ میں روئی کا محصول وصول کرنے کی نوکری دی گئی۔

بھڑوچ بہت اچھی بارونق جگہ ہے۔ پہاڑ کے نیچے گہری کھڈوں میں سُستا ندی پتھریلی بیں ٹیڑھی ٹیڑھی بہہ رہی ہے۔ ٹھیک اسی ندی کے کنارے پہاڑ کے نیچے پتھر کے پندرہ صد زینوں والے گھاٹ کے اُوپر ایک سنگ مرمر کا محل بنا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد کوئی آدمی نہیں رہتا۔ بھڑوچ کا بازار اور گاؤں یہاں سے بہت دُور واقع ہے دو سو برس کے قریب ہوئے ہونگے۔ جب شاہ محمود نے اپنے علیش و عشرت کے لئے یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ اُس وقت محل کے حمام کے فوّاروں سے گلاب کا عطر برسا کرتا تھا۔ اور اسی جگہ سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فارس کی نوجوان بیگمیں نہانے سے پہلے سر کے لمبے لمبے بال کھول کر ستار کو گود میں رکھ کر غزلیں گایا کرتی تھیں۔

اس وقت نہ تو اب وہ فوّارے ہی چھُٹتے ہیں۔ اور نہ وُہ گانے ہی ہوتے ہیں۔ سنگ مرمر کے فرش پر اب وُہ نازک پاؤں بھی نہیں پڑتے۔ مگر اس وقت وہ مجھ ایسے محصول کلکٹروں کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ مَیں بھی اسی محل میں رہنے لگا۔ لیکن دفتر کے بڈھے چپڑاسی فضل خان نے مجھے کئی دفعہ منع کیا کہ مَیں اس محل میں نہ رہوں۔ ایک دفعہ اس نے

کہا۔ کہ اگر آپ نہیں مانتے۔ تو کم ازکم رات کو وہاں نہ جایئے گا۔ مگر میں نے ہنس کر بات اُڑا دی۔ نوکروں نے بھی صاف صاف کہدیا۔ کہ وہ دن کو تو کام کر دیا کرینگے۔ مگر رات کو وہاں نہیں رہیں گے۔ وہ گھر اتنا بدنام ہوگیا تھا کہ چور بھی اُس گھر میں گھُسنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔

پہلے پہل آنے پر اس عیز آبادپتھر کے محل میں مجھے بھی کچھ کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ جہاں تک ہوتا تھا۔ مَیں تمام دن باہر ہی رہتا تھا اور رات کو تھکا ماندہ آکر بستر پر لیٹ رہتا تھا۔

لیکن ایک ہفتہ بعد ہی ایک عجیب نشہ مجھ پر غالب آنے لگا۔ وہاں کئی عجیب اور حیران کُن واقعات ہونے لگے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ بازار میں اتنی رونق نہ تھی۔ کام کاج بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ سُورج غروب ہو رہا تھا۔ مَیں اُسی دریا کے کنارے آرام کُرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ ندی سُوکھ رہی تھی۔ دُوسرے کنارے پر بالو کے کئی انبار لگے ہُوئے تھے۔ جو سُورج کی شُعاؤں سے دوپہر کے وقت رنگین معلوم پڑتے تھے۔ اس کنارے دریا کے صاف پانی میں شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔

سُورج آہستہ آہستہ پہاڑ کے پیچھے پیچھے غروب ہوگیا اُسوقت

میری خواہش گھوڑے کی سواری کرنے کی تھی۔ مگر عین اُسی وقت پیچھے سے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

شائد مجھے مغالطہ ہو گیا ہو۔ یہ سمجھ کر میں پھر بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی کسی پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ جیسے بہت سے آدمی میری طرف بھاگے چلے آتے ہیں۔ خوف کے مارے میرا جسم کانپ اُٹھا۔ گو میرے سامنے کوئی آدمی نہ تھا۔ تو بھی مجھے معلوم ہونے لگا۔ کہ اس گرمی کی شام کو کئی نازک عورتیں غسل کے لئے زینے اُتر رہی ہیں۔ گو اس شام کو پہاڑ کے کنارے کے سناٹے میں کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ فوّارے چل رہے ہیں۔ اور اُن میں سے سینکڑوں دھاروں کی طرح مذاق کرتی ہوئی کئی حسین عورتیں میرے پاس سے نکل گئیں۔ اور مجھ سے ذرا بھی شرمائی تک نہیں۔

میرے سینہ میں ایک اُبال سا اُٹھا۔ دل دھڑکنے لگا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ خوف کی دھڑکن تھی یا خوشی کی۔ بڑی خواہش ہوئی کہ اچھی طرح دیکھوں۔ مگر سامنے دیکھنے کی کوئی چیز نہ تھی۔ اچھی طرح کان لگا کر سننے سے اُن کی سب باتیں سُن سکتا ہوں۔ مگر جب کان لگا کر سننے لگا تو پازیب کی آواز کے علاوہ کچھ اور نہ سنائی دیا۔

یکا یک ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ دریا کے پانی میں ہل چل مچ گئی۔

وہ ایک دوشیزہ کے بالوں کی طرح ہوا میں پھار ٹوٹنے لگا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے کئی نوجوان خوبصورت عورتیں برہنہ دریا کے گھاٹ کی سیڑھیاں سے نیچے اُتر رہی ہیں۔ اور پھر پانی میں کھیل رہی ہیں۔ مگر یہ سب وہم تھا ـــــــــ اس میں اصلیت نہ تھی۔

اس واقع سے میرے دل میں شک گذرا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے اکیلا پا کر کوئی بھوت میرے دل میں گھس گیا ہو۔ مَیں غریب رُوئی کا محصُول وصُول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ شاید مجھے یہ اس حالت میں نہ دیکھ سکتا ہو۔ مَیں نے دل میں کہا۔ آج خوب کھانا کھانا چاہیئے۔ شاید پیٹ خالی رہنے سے ہی یہ خیالات میرے دماغ میں موجود رہتے ہوں۔ مَیں نے باورچی کو بُلا کر کہا۔ آج کھیر۔ حلوہ۔ پلاؤ وغیرہ سب کچھ بناؤ۔

دُوسرے دن بستر سے اُٹھنے پر یہ واقعات بہت ہی پُر مذاق معلُوم پڑے۔ خوشی خوشی اپنا ہیٹ پہن کر کام پر چلا۔ اس دن کام زیادہ تھا۔ اس لئے شام کو دیر ہو گئی جب محل کے نزدیک پہنچا۔ تو نہ معلوم کون کہہ رہا تھا۔ "تم بہت ہی بے وفا ہو۔ اتنی دیر کیوں کی۔ ہم یہاں انتظار کر رہی ہیں۔"

محل کی سیڑھیوں کے اُوپر پہنچتے ہی سامنے کا ہال کمرہ بہت ہی بڑا تھا۔ اس میں تین بڑے بڑے اور اُونچے اُونچے ستُون تھے جن پر

بہت قسم کی مینا کاری کی ہوتی تھی۔ یہ ہال ہمیشہ سے ہی سنسان رہتا تھا۔ آج بھی وہاں روشنی نہ تھی۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی میں کمرہ کے اندر داخل ہوا ویسے ہی گھر کے اندر گھبراہٹ مچ گئی۔ جیسے بہت سی دوشیزائیں برآمدوں سے ادھر اُدھر بھاگ گئیں۔ میں کہیں بھی کچھ نہ دیکھ کر سناٹے میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ستون کے درمیان کھڑا تھا۔ کہ ویسے ہی عطر کی مہک آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے فوّارے چھُوٹ رہے ہیں۔ اور اُن میں کا نکلا ہوا پانی جھر جھر کر کے سنگ مرمر کے فرش پر گر کر ستار بجا رہا ہے۔ کبھی نریوروں کی چھنچھناہٹ کی آواز آتی۔ اور کبھی کسی کے گانے کی آواز آتی۔ جیسے کویل گا رہی ہو۔ میں کھڑا کھڑا پاگل سا ہو گیا۔

اُسی وقت میرا نوکر لیمپ جلا کر میرے پاس لے آیا۔ نہ معلوم اس نے مجھے پاگل سمجھا یا نہیں۔ لیکن اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ میں میں ہوں۔ اور یہ بھی میں نے سوچ لیا۔ کہ اس بات کو تو ہمارے شاعر لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ دُنیا میں کوئی خیالی فوّارہ بھی چھُوٹ سکتا ہے یا نہیں۔ اور کوئی خیالی دوشیزہ خیالی انگلیوں سے ستار بجا سکتی ہے یا نہیں لیکن یہ ٹھیک تھا۔ کہ رُوئی کا محصُول وُصول کر کے ساڑھے تین صد روپیہ ماہوار پاتا ہُوں۔ تب پھر اپنے پہلے وہم کو یاد کر کے اپنے بستر پر بیٹھ کر

اخبار پڑھتے ہوئے ہنسنے لگا۔

اخبار بینی کے بعد کھانا کھا کر لیمپ گل کر کے مَیں سو رہا۔ میرے سامنے کی کھڑکی سے نظر ڈال کر اندھیرے جنگل سے گھرے ہوئے پہاڑ پر کوئی چارپائی پر بیٹھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ انہی خیالات میں نہ معلوم مَیں کب سو گیا۔ اور کب تک سوتا رہا۔ لیکن اچانک ہی چونک اُٹھا۔ گھر میں ضرور کھٹکا ہوا تھا۔ لیکن کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ اندھیرے پہاڑ پر سے دیکھنے والا غائب ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میرے کمرے کی کھڑکی سے فرش پر میں آ رہی تھی۔

کوئی بھی آدمی نہ دکھائی دیا۔ تب بھی مجھے معلوم ہوا۔ کہ کوئی مجھے آہستہ آہستہ دھکیل رہا تھا۔ میرے جاگتے ہی اس نے مجھے اشارہ سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

مَیں چپکے چپکے اُٹھا۔ لیکن اتنے بڑے محل میں میرے علاوہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ تو بھی قدم قدم پر یہ خوف پیدا ہونے لگا۔ کہ میرے قدموں کی آہٹ سے کہیں کوئی جاگ نہ پڑے۔ محل کے سب کمرے بند پڑے رہتے تھے۔ اور ان کمروں میں کبھی گیا بھی نہ تھا۔

اُس رات سانس روکے قدم بڑھاتا ہوا۔ مَیں اس کے پیچھے کہاں جا رہا تھا۔ مَیں یقین سے کہہ نہیں سکتا۔ کتنے ہی تنگ اندھیرے استے

کتنے ہی برآمدے گزر کر میں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔

میری عجب رہبر۔ مجھے آنکھوں سے دکھائی نہ دی۔ لیکن اس کی صورت میرے دل میں تھی۔ وہ عرب کی عورت تھی۔ ڈھیلی آستین کا کرتہ ٹوپی کے کنارے سے ایک بُرقعہ سا پڑا تھا۔ کمر میں ایک کٹار تھی۔

آخر کار میری رہبرہ ایک لال رنگ کے پردے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اور مجھے بھی اُدھر آنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن ڈر کے مارے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پردے کے سامنے زمین پر کمخواب کی پوشاک پہنے ایک حبشی ننگی تلوار پاس رکھے دونوں ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہے۔ رہبرہ نے اس کی ٹانگیں عبور کر کے پردے کا ایک حصّہ کھینچ دیا۔

پردے کے پیچھے فارسی قالین کا فرش تھا۔ تخت کے اوپر کوئی بیٹھا تھا۔ مگر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کون ہے۔ لیکن سبز رنگ کے کھُلے پاجامہ کے نیچے زری کا جوتہ پہنے دو خوبصورت پاؤں مخملی گدّے پر رکھے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک کنارے ایک تپائی پر چاندی کے برتن میں کچھ پھل وغیرہ پڑے تھے۔ اس کے پاس ہی دوسری تپائی پر دو جام اور ایک بوتل بڑھیا شراب کی رکھی تھی۔ ایک طرح کا نشہ دینے والی بھینی بھینی خوشبو سے میں اپنے آپ کو بھول گیا۔

مَیں دل کی بے کلی کو دبائے حبشی کی ٹانگوں کو عبور کرنے لگا۔ ویسے ہی وہ چونک پڑا۔ اُس کی چھاتی پر رکھی ہوئی تلوار زمین پر جھنکار کے ساتھ گر پڑی۔

اچانک ہی عجیب آواز سُن کر مَیں بھی چونک پڑا۔ دیکھا۔ اُسی اپنے بستر پہ لیٹا ہوا ہوں ــــــ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ چاند کی جگہ سُورج نے لے لی تھی۔

میرے دن کے ساتھ رات کی سخنی دشمنی ہوگئی۔ جاگنے کی تھکاوٹ سے جسم سُست ہونے لگا۔ اُسی سُست جسم سے کام کرنے جاتا تھا۔ اور اس وقت رات کو بہت ہی منحوس۔ خوفناک اور جادُوگرنی سمجھتا تھا۔ لیکن رات کو دن بھر کے ماندے جسم کو دیکھ کر دن کو بُرا کہتا تھا۔

شام کے بعد میں ایک نشے میں پھنس جاتا تھا۔ تب کوٹ پتلون مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ تب میں خیالات کی دُنیا میں مبتلا ہو کر۔ سر پہ نیلے رنگ کی مخملی ٹوپی۔ ڈھیلا پائجامہ اور مخملی پاپوش پہن کر رومال کو عطر لگانا۔ اور سیگرٹ کی جگہ بنارسی تمباکو پھانکتا اور ایک تخت پر جا بیٹھتا تھا۔

اس کے بعد رات جتنی زیادہ گذرتی۔ اُتنا ہی لُطف ہوتا۔ جسے مَیں ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے موسم بہار کے پھول ہوا میں اُس محل کے کمروں میں اُڑتے پھرتے اور رجو تھوڑی

دُور تک تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر بعد میں نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور مَیں بھی ان کے ڈھونڈنے کے لئے جیسے ہر کمرے میں گھُومتا تھا۔

اسی نشے میں مَیں حنا کی خُوشبو۔ستار کا بجنا۔ اور اُس دوشیزہ کو ہر دم جسامن رنگ کا دوپٹہ اور اُس کے نازک پاؤں میں کامدار جُوتا اور پھُولدار انگیا۔ اور لعل سُنہری ٹوپی دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔

اُس نے مجھے پاگل بنا دیا۔ مَیں اُسی کے فراق میں خواب کی دُنیا میں نہ معلوم کس نشہ میں مست اُس "نایاپھ رسی" کی گلی گلی اور کمرہ کمرہ میں گھُومتا پھرتا تھا۔

کبھی کبھی تو مَیں آئینہ کے سامنے بیٹھ کر خُوب سج دھج کرتا تھا۔ اُسی وقت اچانک دکھلائی دیتا۔ کہ آئینہ میں میرے عکس کے پاس اُسی دوشیزہ کا سایہ پڑتا تھا۔ دم بھر میں گردن ٹیڑھی کر کے اپنی بڑی موٹی آنکھوں سے اشارہ کرتی اور ایک انداز سے بھاگ جاتی تھی۔ اس وقت میرے دل میں چنگاریاں اُٹھتی تھیں۔ مَیں سج دھج کرنا چھوڑ کر پاس پڑی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ میری چاروں طرف پہاڑی ہوائیں جیسے بہت محبت۔ بہت بوسے۔ اٹھکھیلیاں کرتے ادھر اُدھر

گھومتے پھرتے تھے۔

ایک دن تیسرے پہر مَیں نے گھوڑے پر سوار ہو کر گھومنے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ معلوم کون طاقت مجھے ایسا کرنے سے روکنے لگی۔ لیکن اس دن میں نہ رُکا۔ کھونٹی پر میرا کوٹ اور ہیٹ لٹک رہی تھی۔ اُسے اتار کر پہننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوا کا ایک جھونکا اتنے زور سے آیا کہ میرا کوٹ اور ہیٹ میرے ہاتھ سے نکل کر ہوا کی تیزی میں شامل ہو گئے۔

اس دن پھر سیر کو جانا رُک گیا۔ مَیں نے کھانا کھا کر سونے کا ارادہ کیا۔ لیکن آدھی رات گذرے پھر اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا جیسے کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ جیسے کوئی میری چارپائی کے نیچے۔ فرش کے اندر۔ اُس محل کی پتھر کی دیوار تلے کسی قبر میں سے کوئی رو رو کر کہہ رہا ہے۔ "تم مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

مَیں کون ہوں۔ مَیں کس طرح اور کس دوشیزہ کو اس خوابی دُنیا کی قبر سے کھینچ کر لے چلوں۔ تم اب تک کہاں تھی۔ اے میری جان! تم کس جھیل کے کنارے کھجور کے درختوں کے جُھنڈ کی چھایا میں کس گھر اور کس شہر میں پیدا ہوئی ہو۔ یہ تھے میرے دماغ کے خیالات۔

اُسی وقت چپڑاسی پاگل کی طرح چلا اٹھا ـــــ "الگ رہو۔

سب جھوٹ ہے"۔۔۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔

چپڑاسی نے صبح کی ڈاک لاکر مجھے دی۔ اور باورچی نے آکر پوچھا "آج کیا کھلائیے گا؟"

میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اب اس گھر میں نہ رہوں گا! اسی دن اپنا سامان اُٹھواکر دُوسرے گھر میں رہنے لگا۔ دفتر کا چپڑاسی مجھے دیکھ کر مُسکرایا۔ میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

جیسے جیسے شام نزدیک آرہی تھی۔ ویسے ہی میں خیال کرنے لگا کہ میں نے کہیں جانا ہے۔ دفتر کے کام میں دل نہ لگا۔ میں قلم پھینک کر بڑا رجسٹر دھم سے بند کرکے اُسی وقت تانگہ پر سوار ہوکر وہاں سے چل دیا۔ دیکھا غالباً نہ شناختہ تانگہ خود بخود ہی اس محل کے دروازہ پر جا رُکا۔ میں جلدی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

آج تمام کمروں میں سناٹا تھا۔ اندھیرا گھپ جیسے ناراض ہوکر منہ پھُلائے ہوئے تھا۔ نفرت سے میرا دل تلملا اُٹھا۔ لیکن کس کو اپنی نفرت دکھاتا۔ اور کس کو رُوٹھنے سے مناتا اور کس سے مُعافی مانگتا؟ گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں بے تاب دل سے اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ دل گانے کو للچانے لگا۔

اچانک ہی میری پیشانی پر اوپر سے دو بوند آنسو آکر گرے۔

اُس پہاڑ پر خوب گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اندھیرا جنگل اور دریا کا پانی سیاہ تختہ کی طرح معلوم دیتا تھا۔ اچانک ہی جیسے زمین و آسمان تھر تھر کانپ اُٹھے۔

آج میرے ملازم بھی نئے مکان میں تھے۔ محل میں لیمپ جلانے والا کوئی نہ تھا۔ اس اندھیرے میں مَیں محسوس کرنے لگا۔ کہ دوشیزہ فرش پر بیٹھی اپنے بال نوچ رہی ہے۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے کبھی کبھی تو وہ پاگلوں کی طرح ہنس دیتی ہے۔ اپنی انگیا کو پھاڑتی اور اپنی چھاتی پیٹتی ہے۔ کھلے ہوئے دروازوں سے ہوا کے جھونکے آ رہے ہیں۔

رات بھر پانی برستا رہا۔ میں اندھیرے کمروں میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ کہیں بھی کوئی نہ تھا۔ اُسی وقت میرا چپڑاسی چلا اُٹھا۔ "الگ رہو۔ ہٹے رہو۔ سب جھوٹ ہے"۔

مَیں نے دیکھا کہ صبح ہو گئی ہے۔ اور چپڑاسی اپنے اصول کے مطابق اُسی محل کے چاروں طرف گھوم کر وہی صدا لگا رہا ہے۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ شاید یہ بوڑھا چپڑاسی بھی کبھی میری ہی طرح محل میں رہ چکا ہے۔ اب پاگل ہو کر بھی اس جال سے آزاد نہیں ہو سکا۔

مَیں اُسی دم برسات میں اس کے پاس بھاگا گیا۔ اور اُس سے پُوچھا "مہر علی کیا جھُوٹ ہے"۔

وُہ میری بات کا جواب نہ دے کر پاگلوں کی طرح ہنستا ہوا محل کے گرداگرد بھاگنے اور چلانے لگا۔ "ہنسے رہو۔ سب جھُوٹ ہے۔ سب جھُوٹ ہے"۔

مَیں اُسی دم دفتر میں جاکر دُوسرے چپڑاسی سے بولا۔ کریم خان تم بتاؤ۔ کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

کریم خان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں سارا قصّہ مختصر طور پر بیان کیا۔

اس نے کہا اس محل میں پہلے بہت محفلیں لگا کرتی تھیں۔ ناچ رنگ کا تو کہنا ہی کیا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا۔ جب ستار اور دُوسرے سازوں کی آواز نہ آتی ہو۔ اور اس محل میں محبّت کی آگ جلا کرتی تھی۔ انہیں سب دلوں کی جلن سے۔ انہیں سب پُرمحبّت گانوں کے فراق میں محل کے پتھر تک بیتاب ہیں۔ نوجوان اور خوبصورت آدمی کو پاکر وہ اسے اپنے سے جُدا کرنا نہیں چاہتے۔ جو تین رات تک اس محل میں رہا۔ وہ پھر باہر نہیں جا سکا۔ مگر مہر علی پاگل ہو کر یہاں سے باہر نکل آیا۔

مَیں نے پُوچھا ـــــ "تو کیا اب میرے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟"

کریم خان نے کہا "صرف ایک راستہ ہے۔ جو بہت مشکل ہے سُنیئے ـــــ لیکن وہ راستہ بتانے سے پہلے گل باغ کی ایک ایرانی خادمہ کا قصّہ کہنا بہت ضروری ہے۔ ویسا حیران کُن اور دل توڑ واقع آج تک نہیں ہوا ہوگا۔

اسی وقت کُلیوں نے آکر کہا۔ گاڑی آرہی ہے۔ جلدی میں بچھونے باندھتے باندھتے گاڑی آگئی۔ اُس گاڑی کے ایک فرسٹ کلاس ڈبہ میں سے ایک انگریز سٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں کھڑکی سے سر باہر نکالے کھڑا تھا۔ ہمارے نئے دوست کو دیکھتے ہی وہ "ہیلو" کہہ کر خوشی سے چلا اُٹھا۔ اس انگریز نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ہم لوگ سیکنڈ کلاس کے ڈبّہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ شخص پھر نہ ملا اور نہ ہی ایرانی نوکرانی کا قصّہ معلوم ہوا۔

مَیں نے اپنے دوست سے کہا۔ وُہ شخص ہم کو بے بہرہ دیکھ کر ہمیں بے وقوف بنا گیا ہے۔ یہ قصّہ شرُوع سے آخیر تک جھوٹ ہے اس طعنہ زنی پر میری اور میرے دوست کی کھٹ پٹ ہوگئی۔

شعلۂ الم

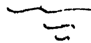
افسانہ نمبر ۱۴

آخری خواہش

اِس عالم کے جشن میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ جس سے میری زندگی خوشی سے بھر گئی ہے۔ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ میرے کان سن چکے ہیں۔

اِس جشن میں ساز بجانے کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔ میں نے کیا۔

میں دریافت کرتا ہوں۔ کہ کیا وہ وقت آگیا۔ کہ میں اندر داخل ہو سکوں۔ اور تیرا حسین چہرہ دیکھ کر اپنا خاموش پرنام تیرے چرنوں میں پیش کردوں



شعلۂ الم

کانپور کے زمیندار بابو رام گوپال کے گھر کی ودھوا بہو کے والدین میں سے کوئی نہ تھا۔ سسرال میں بھی اپنا کہلانے والا کوئی نہ تھا۔ نہ خاوند تھا۔ اور نہ ہی کوئی بیٹا۔ بیٹی۔ اس کے خاوند کے بڑے بھائی رام گوپال کا ایک ننھا سا بچہ تھا۔ جسے بہو بہت ہی محبت کرتی تھی۔ اس بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی والدہ بہت عرصہ تک بیمار رہی۔ اس لئے بچہ کی پرورش بہو۔ کلیانی نے ہی کی۔ بچہ اس سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اپنی حقیقی والدہ کے پاس دم بھر کو بھی نہ جاتا تھا۔ کلیانی بھی اس سے بہت خوش تھی۔

ایک دن اچانک ہی کلیانی اپنے محبت بھرے دل کو بچے کے سپرد کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئی ۔ نہ معلوم کس صدمہ سے اس کی حرکت قلب یک لخت بند ہوگئی ۔ دُنیا کے سب کام حسب معمول چل رہے تھے ۔ مگر اس محبت بھرے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی ۔ بعد میں پولیس آکر تنگ نہ کرے ۔ اس ڈر سے رام گوپال نے چار براہمنوں کو اکٹھا کر کے کلیانی کی لاش کو شمشان پہنچانے کا انتظام جلدی جلدی کر دیا ۔ کانپور کا شمشان بستی سے بہت دُور تھا ۔ تالاب کے کنارے ایک جھونپڑی تھی ۔ اور اس کے پاس ہی بڑ کا ایک گھنا درخت تھا ۔ اس کے علاوہ اس جنگل میں اور کچھ نہ تھا ۔ پہلے اس جگہ ایک نالہ بہتا تھا ۔ جس وقت کا یہ ذکر ہے ۔ اس وقت وہ نالہ خشک ہوگیا تھا ۔ اُسی خشک نالے کے ایک حصّہ کو ٹھیک کر کے شمشان کا تالاب بنا لیا گیا تھا ۔ اس وقت لوگ اس تالاب کو بڑا پاک سمجھتے تھے ۔

لاش کو جھونپڑی میں رکھ کر چاروں آدمی لکڑی کی انتظار میں بیٹھے رہے ۔ لکڑی آنے میں جب بہت دیر ہوگئی ۔ تو ان میں سے دو آدمی یہ دیکھنے کے لئے چلے کہ لکڑی آنے میں اتنی دیر کیوں ہوگئی ہے ۔ اور دو آدمی لاش کے پاس ہی بیٹھے رہے ۔

ساون کی اندھیری رات تھی۔ بادل گھرا ہوا تھا۔ آسمان میں ایک ستارہ بھی نہ تھا۔ اندھیری جھونپڑی میں دونوں آدمی خاموش بیٹھے تھے۔ ایک آدمی کی چادر میں دیا سلائی اور موم بتی بندھی ہوئی تھی۔ مگر بھیگی ہوئی دیا سلائی بہت کوشش کرنے پر بھی نہ جل سکی۔ ساتھ کی لیمپ بھی ہوا کے زور سے گل ہو گئی تھی۔

کچھ عرصہ چپ رہنے کے بعد ایک بولا "اگر اس وقت ایک چلم تمباکو ہوتا۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ جلدی کے سبب سے کچھ بھی ساتھ نہ لیا۔"

دوسرا آدمی بولا۔ "اگر تم کہو۔ تو میں دوڑ کر سب سامان چند منٹوں میں لا دوں؟"

اس کے بھاگنے کے ارادہ کو سمجھ کر دوسرے آدمی نے کہا۔ "باپ رے! اور میں یہاں اکیلا بیٹھا رہوں گا!"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ایک ایک لمحہ گھنٹے گھنٹے کا معلوم ہونے لگا۔ جو لوگ لکڑی لینے گئے۔ ان کو دل ہی دل میں گالیاں دینے لگے۔ ان کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ آدمی ضرور کہیں آرام سے بیٹھے تمباکو پی رہے ہیں۔

وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہاں تالاب کے کنارے مینڈک بولتا

کی آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ اسی وقت ایسا معلوم پڑا۔ جیسے لاش نے جنبش کی۔ مُردہ نے کروٹ بدلی۔

جو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ ایشور کا نام لینے لگے۔ اچانک ہی اُس جھونپڑی میں ایک گہری سانس لینے کی آواز آئی۔ دونوں آدمی ایک دم جھونپڑی سے باہر نکلے۔ اور بھاگتے بھاگتے گاؤں کی طرف چلے۔

دو میل کے قریب دوڑنے پر انہوں نے دیکھا کہ ان کے دونوں ساتھی لیمپ ہاتھ میں لئے واپس آرہے ہیں۔ جو آدمی لکڑیوں کے لئے گئے۔ دراصل وہ تمباکو پینے ہی گئے تھے۔ لکڑیوں کا انہیں کوئی فکر نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا۔ کہ لکڑیاں کاٹی جارہی ہیں۔ دوکاندار ابھی مزدوروں کے ذریعے بھیجے گا۔ تب جو دونوں دوڑکر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے لاش کے ہلنے اور سانس لینے کا واقعہ سُنایا۔ مگر ان دونوں نے ان کا تمسخر اُڑایا۔ اور انہیں لاش اکیلی چھوڑ آنے پر خوب ڈانٹا۔

اُسی وقت پھر چاروں آدمی اس جھونپڑی میں پہنچے جھونپڑی کے اندر جاکر دیکھا۔ لاش غائب تھی۔ کفن کا کپڑا ادھر ادھر پڑا تھا۔

سب لوگ حیرانی سے ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھتے ہوئے۔ جھونپڑی سے باہر آئے۔ باہر بھیگی زمین پر چھوٹے چھوٹے قدموں کے نشان موجود تھے۔

رام گوپال سے اس واقعہ کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر آدمیوں نے صلاح کی کہ لاش جلا دی گئی ہے۔ یہ کہہ کر اپنی جان بخشوانی چاہیئے۔

صبح جو آدمی لکڑیاں لے کر آئے۔ انہیں خبر ملی۔ کہ لکڑیاں دیر تک نہ آنے سے لاش کو جھونپڑی میں پڑی لکڑیوں سے جلا دیا گیا ہے۔ چونکہ لاش کوئی قیمتی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ جسے کوئی دھوکہ دیکر چوری کر لے۔

(۲)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کئی بار انسان پر ایک خاص قسم کی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور کئی کئی گھنٹے تک جسم میں زندگی کا کوئی بھی آثار نظر نہیں آتا۔ اور بعد میں خود بخود زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کلیانی بھی مری نہ تھی۔ بلکہ کسی صدمہ سے بیہوش ہوگئی تھی۔ جس سے اس کی زندگی کے سب آثار غائب ہوگئے تھے۔ جب اُسے ہوش آیا۔ اور اپنے چاروں طرف اندھیرا دیکھا۔ تو گھبرا

گئی۔ اُسے اندھیرے میں بھی معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔
ایک دفعہ اس نے اپنی جیٹھانی کو "بہن جی" کہہ کر بھی پکارا۔ لیکن
اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ خوف کے مارے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے
بے ہوشی کی پہلی یاد آنے لگیں۔

اس کی جیٹھانی رسوئی گھر میں بیٹھی بچے کے لئے دُودھ گرم
کر رہی تھی۔ اپنی گود خالی دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ اسی
سبب سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اس نے بھری آواز میں
پکارا "بہن" بچے کو لے آؤ۔ نہ معلوم میرا دل کیوں ڈھنڈار ہا ہے۔
اس کے بعد چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک
کتاب پر سیاہی کی بوتل اُلٹ گئی ہو۔ اس کی یادداشت کی طاقت
زائل ہو گئی۔ وہ بھول گئی کہ اس وقت بچے نے اسے اپنی توتلی زبان
سے چاچی کہہ کر پکارا بھی تھا یا نہیں۔

پہلے کلیانی کو خیال آیا۔ کہ شاید یم پوری میں ایسا ہی اندھیرا
ہوتا ہے۔ وہاں کچھ بھی سننے اور دیکھنے لائق نہیں ہے۔ نہ کوئی
شغل ہوتا ہے۔ صرف سونا اور سو کر اُٹھ بیٹھنا ہی کام ہے۔

لیکن جب کھلے دروازے سے ہوا کا جھونکا آیا۔ اور مینڈکوں کی آواز سُنی۔ تو اُسے برسات کا خیال آیا۔ ایک بار بجلی چمکی جس سے اُس نے دیکھا کہ باہر تالاب ہے اور تھوڑی دُور پر بڑ کا درخت۔ اُسے یاد آگیا کہ کبھی کبھی تہواروں کے موقعوں پر وُہ اس تالاب پر نہانے آیا کرتی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ گھر چلی چلوں۔ مگر پھر یہ خیال کیا کہ میرا گھر لوٹنا ٹھیک نہیں۔ وہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ مَیں مر گئی ہوں۔ مجھے کوئی گھر نہیں رکھے گا۔ میرے وہاں جانے سے لوگ بُرا خیال کرینگے۔ دُنیا سے تو مَیں اُٹھ گئی ہوں۔ اب ایک بھُوت ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو بھلا لوگ مجھے کیوں رام گوپال کے عالیشان گھر سے لاکر یہاں سُنسان شمشان میں پھینک جاتے۔ رام گوپال کے گھر میں بے ہوشی کا واقعہ اس کے ذہن میں آگیا۔ اور اپنے کو اپنی بستی سے اتنی دُور پاکر وُہ سوچنے لگی۔ کہ اب میرا اس زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مَیں اب اپنی رُوح کی چھایا ہوں۔

یہ سوچ کر وُہ جھونپڑی سے نکلی اور چلدی۔ ڈر۔ فکر اور شرم وحیا اب اُس سے کوسوں دُور تھے۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں تھک گئے۔

وہ کمزوری محسوس کرنے لگی۔ مگر کسی طرح بھی وہ سنسان جنگل ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

صبح ہوئی تو اُسے گاؤں کے گھروں سے دھواں نکلتا دکھائی دیا۔ اس وقت اُسے کچھ ڈر سا معلوم ہوا۔ اُسے یہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ زمین کے ساتھ۔ انسانوں کے ساتھ اس کا اس وقت کیا رشتہ ہے۔ جب تک وہ سنسان جنگل میں تھی۔ رات کے اندھیرے میں تھی۔ تب تک وہ بے خوف تھی مگر اب بستی کے آدمیوں سے ڈر سا آنے لگا۔

زیادہ چلنے اور برسات کے ہونے کے سبب سے کلیانی کے سب کپڑے کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ تھکاوٹ اور رات کے جاگنے سے اس کے چہرے سے پاگل پن ٹپکتا تھا۔ شاید گاؤں کے لڑکے اُسے پاگل سمجھ کر پتھر مارتے۔ مگر خوش قسمتی سے سب سے پہلے اسے ایک راہگیر ملا۔ اس شریف راہگیر نے کلیانی سے کہا "آپ کسی بھلے گھر کی معلوم پڑتی ہیں۔ اس حالت میں اکیلے کہاں جا رہی ہیں؟"

کلیانی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ دُنیا میں ہے۔ یا وہ کسی بھلے خاندان کی ہے۔ راہگیر کی یہ سب باتیں اُسے ایک خواب سی

معلوم ہونے لگیں!

راہگیر نے پھر بڑی ہمدردی سے کہا: "چلو بیٹی میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

کلیانی سوچنے لگی۔ سسرال تو جا ہی نہیں سکتی۔ اور والدین کے ہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔ تب اسے اپنی ایک سہیلی کا خیال آیا۔ سہیلی کامنی سے گو وہ لڑکپن سے ہی الگ ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی ہی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو خط و کتابت میں شکوہ شکایت کے سبب سے آپس میں رُوٹھ بھی جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک دُوسرے کو یہی بتانا چاہتی تھیں کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو کون زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس بات کا کسی کو خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ ملاقات ہونے پر کوئی بھی کسی کو لمحہ بھر کے لئے اپنی آنکھوں سے الگ نہ کر سکے گی۔

کلیانی نے اس راہگیر سے کہا۔ کہ انبالہ میں بابو کالی چرن کے گھر جاؤں گی۔

وہ راہگیر لاہور جا رہا تھا۔ اور انبالہ ان کے راستہ میں ہی تھا۔ اس لئے اُس نے اسے اپنے ساتھ انبالہ لے جانے میں کوئی غیر واجب بات نہ دیکھی۔ اور اسے بابو کالی چرن کے ہاں پہنچا دیا

دونوں سہیلیاں بہت مدت بعد ملیں تھیں۔ اس لئے چند منٹ ایک دُوسرے کو پہچاننے میں دیر ہوئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک دُوسرے کو پہچان گئیں۔

کامنی نے کہا "بہن آج تو مَیں بہت ہی خوش ہوں اور اپنے کو خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ جو تمہارے درشن ہوئے۔ مجھے تو اب تمہارے ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی۔ مگر تم یہاں کیسے آئی ہو۔ سُسرال والوں نے تمہیں نکال دیا ہے؟

کلیانی نے بھری آوازسے جواب دیا "بہن سُسرال کا ذکر مت کرو۔ مجھے یہاں ایک نوکرانی کی طرح رکھ لو۔ مَیں تمہارا سب کام کر دوں گی۔"

کامنی نے اُسے محبّت سے ایک ہلکا سا تھپّڑ رسید کیا۔ اور کہا کیا باتیں بکتی ہو۔ تم میری سہیلی ہو۔ تم میری......

اتنے ہی میں بابو کالی چرن گھر میں آگئے۔ کلیانی حیرانی سے اس کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر وہاں سے دُوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ اس نے نہ تو پردہ ہی کیا۔ اور نہ شرم ہی ظاہر کی۔ کامنی نے اس کے متعلق اپنے خاوند کو سمجھا دیا۔

کلیانی کامنی کے گھر تو آگئی۔ مگر اس سے بے تکلّف نہ ہو سکی

اُسے ہر وقت اپنے متعلق ایک قسم کا شک سا لگا رہتا تھا۔ وُہ
کامنی کی طرف غور سے دیکھتی اور نہ معلوم کیا سوچتی رہتی تھی۔ وُہ سمجھتی
تھی کہ کامنی اور اس کا خاوند اس سے بہت دُور رہتے ہیں۔ کسی
دوسری ہی دُنیا میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مَیں ایک چھایا ہُوں۔ کامنی
بھی کلیانی کی یہ حالت دیکھ کر فکر مند ہوئی۔ وُہ اسے نہ سمجھ سکی عورتیں
یہ نہیں چاہتی ہیں۔ کہ کوئی راز وُہ چھپائیں۔ اور نہ دُوسرا ان سے
کوئی راز پوشیدہ رکھے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ایک دُوسرے
سے تنگ آجاتی ہیں۔ عورت کی فطرت میں یہ بھی ایک چیز ہے۔
کلیانی اپنے کو کامنی سے دُور رکھنے کی جتنی ہی کوشش کرتی۔
اتنا ہی کامنی اس سے ناراض رہنے لگی۔ اس نے سوچا۔ یہ کیا آفت
مَیں نے اپنے سر اُٹھالی ہے۔ مگر ادھر کلیانی خود ہی اپنے سے ڈرتی
تھی۔ وُہ خود ہی اپنے پاس سے بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر بھاگ نہیں
سکتی۔ اسی لئے کبھی کبھی وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑی پڑی چلا اُٹھتی
تھی۔ اس کے ان افعال سے گھر کے لوگ بھی اس سے ڈرنے لگے۔
نوکروں وغیرہ کو بھی گھر میں بھُوت دکھلائی دینے لگے۔ ایک دن
رات کے وقت کلیانی اپنی کوٹھڑی سے اُٹھ کر روتی ہوئی کامنی
کے کمرے میں گھُسی۔ اور بولی "بہن۔ مَیں تمہارے پاؤں چھُوتی

ہوں اکیلے مجھ سے رہا نہیں جاتا!" کامنی کو جیسے ڈر لگا۔ ویسے ہی غصہ کے مارے تمتما اُٹھی۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ اسے ابھی گھر سے باہر کرے۔ مگر مہربان کالی چرن نے بہت سمجھا کر اسے ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے کمرے کے پاس کی کوٹھڑی میں کلیانی کی رہائش کا انتظام کرا دیا۔

دُوسرے دن کامنی نے اپنے خاوند سے کہا۔ "تم کیسے آدمی ہو۔ ایک عورت اپنے سُسرال سے نکل کر تمہارے گھر میں آ کر رہی ہے۔ ایک ماہ سے اوپر ہو گیا۔ مگر وہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مگر تم ہو کہ اس بات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ کیا مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟

کالی چرن سمجھتے تھے۔ کہ کلیانی کے سُسرال والے ضرور اس پر ظلم کرتے ہونگے اور اُس ظلم کو برداشت نہ کرتے ہُوئے ہی یہ ہمارے گھر میں آ گئی ہے۔ اس کے والدین بھی نہیں ہیں۔ اس حالت میں مَیں کس طرح اسے گھر سے نکال دوں۔ مگر کامنی کی باتوں سے بھی اس کو دلی چوٹ پہنچی۔ اپنے گھر کی خُوشیوں کو وُہ مٹانا نہ چاہتا تھا۔ آخر وہ کانپور کلیانی کے سُسرال میں گیا۔

جب کالی چرن کانپور گئے۔ تو کامنی۔ کلیانی کے پاس آئی اور بولی:۔ "اب تمہارا یہاں رہنا نہ ہو گا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں"۔

کلیانی نے سنجیدگی سے کہا" مگر میرا لوگوں سے کیا رشتہ ہے؟"

یہ سُن کر کامنی سناٹے میں آگئی اور کرخت لہجہ میں بولی" تمہارا رشتہ نہ ہو۔ مگر ہمارا تو ہے۔ ہم دُوسرے گھر کی بہو بیٹی کو کیا کہہ کر اپنے گھر رکھ سکتے ہیں۔ تم سُسرال کیوں نہیں چلی جاتی؟"

کلیانی نے کہا" میرے سُسرال اب کہاں ہیں ــــ بہن؟"

کامنی نے کہا" باپ رے۔ تم کہتی کیا ہو؟"

کلیانی نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا" کیا تم لوگوں کی کچھ ہوں؟ تم لوگ ہنستے ہو۔ روتے ہو۔ پیار کرتے ہو۔ اور سب باتیں کرتے ہو۔ اور میں صرف تمہارا منہ دیکھا کرتی ہوں۔ تم انسان ہو۔ اور میں چھایا ہوں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایشور نے مجھے ایک دفعہ لے کر بھی کیوں تمہاری دُنیا میں بھیجدیا ہے؟"

کلیانی کی یہ باتیں سُن کر کامنی نے اس کا مطلب کچھ اور ہی نکالا۔ وُہ اس کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اس نے کچھ جواب بھی نہ دیا۔ مُنہ پُھلاکر کمرہ سے چلدی۔

(۳)

رات کے ساڑھے دس بجے جب کالی چرن کانپور سے واپس آیا اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش اتنے زور سے

ہو رہی تھی۔ کہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ اب بند نہ ہو گی۔

کامنی نے پوچھا "سنائیے کیا ہوا؟"

کالی چرن نے کہا "بہت سی باتیں ہیں پیچھے کہوں گا" یہ کہہ کر اس نے کپڑے اتار سے کھانا کھایا۔ اور پھر لیٹ کر تمباکو پینے لگے۔ ان کے چہرہ سے غمگینی ٹپکتی تھی۔

کامنی بہت دیر سے چپ تھی۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا "کہو۔ کیا سنا؟"

کالی چرن نے کہا "تم نے ضرور غلطی کی ہے"۔ کامنی یہ سن کر اپنے دل میں شرمندہ ہو اٹھی۔ عورت کبھی بھول نہیں کرتی۔ اور اگر کرے بھی تو ایک عقلمند آدمی کو اسے عورت پر ظاہر نہ کرنا چاہئے۔ اس غلطی کو اپنے سر لینے ہی میں بھلائی ہوتی ہے۔ کامنی نے ذرا گرم ہو کر کہا۔ "کیسی غلطی ذرا میں بھی تو سنوں"۔

کالی چرن نے کہا "جس عورت کو تم نے گھر میں رکھا ہے۔ وہ تمہاری کلیانی نہیں ہے"۔

ایسی بات سن کر غصہ آجانا بالکل معمولی بات ہے اور خاص کر اپنے خاوند کے منہ سے سن کر کس طرح عورت اپنے آپ میں رہ سکتی ہے؟

"بہت خوب۔ میں اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔ تمہارے پہچاننے سے تو پہچانوں گی" میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔ مگر میں یقین سے کہتا ہوں۔ کہ تمہاری سہیلی مر چکی ہے۔ اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔

کامنی نے ہنس کر کہا" ذرا ان کی باتیں تو سنو۔ تم ضرور کوئی غلطی کر آئے ہو۔ تم کسی اور کے ہی گھر چلے گئے ہو۔ تم سے وہاں جانے کو کس نے کہا تھا۔ ایک خط لکھ کر بھیج دینے سے ہی سب معاملہ صاف ہو جاتا"

اپنی عورت کی اس طعنہ زنی سے اداس ہو کر کالی چرن اس بات کا ثبوت دینے لگے۔ مگر اس بات کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ دونوں طرف سے "ہاں نہ" ہوتے ہوتے آدھی رات سے زیادہ گذر گئی۔ مگر دل سے دونوں ہی کلیانی کو گھر سے نکال دینے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ کالی چرن کا خیال تھا کہ وہ عورت کلیانی بن کر اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اور اس نے کامنی کو دھوکا دیا ہے۔ اور کامنی کا خیال تھا۔ کہ کلیانی گھر سے ناراض ہو کر بھاگ نکلی ہے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی کوئی اپنی ہار نہ مانتا تھا۔ کالی چرن کہتا۔ وہ کلیانی نہیں ہے۔ اور کامنی کہتی کہ کلیانی یہی ہے۔

اسی طرح بحث کرتے کرتے دونوں کی آواز تیز ہوگئی۔ انہیں اس بات کا خیال نہ رہا۔ کہ بغل کی کوٹھڑی میں کلیانی کی رہائش ہے۔

کالی چرن نے کہا۔ "بڑی مشکل کی بات ہے۔ میں سُن آیا ہوں کلیانی مر چکی ہے۔"

"میں کیسے یقین کر دوں۔ جبکہ وہ میرے سامنے موجود ہے۔"

"اچھا تو کلیانی کب مری تھی؟"

اس نے سوچا کہ کلیانی کے مرنے کی تاریخ اس کی کسی چھٹی کی تاریخ سے ملا کر اپنے خاوند کو نیچا دکھلا دیگی۔

مگر جب کالی چرن نے کلیانی کے مرنے کی تاریخ بتلائی۔ تو حساب کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ جس دن کلیانی ان کے گھر آئی تھی۔ ٹھیک اس کے ایک دن پہلے کلیانی کے مرنے کی تاریخ تھی۔ یہ دیکھتے کامنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کالی چرن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

عین اُسی وقت کامنی کے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ ہوا سے چراغ گل ہو گیا۔ کمرہ میں اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کوئی تین پہر کے قریب رات گذری ہوگی۔ باہر پانی برس رہا تھا۔

کلیانی نے کہا "بہن۔ میں تمہاری سہیلی کلیانی ہی ہوں لیکن

اب میں زندہ نہیں مرچکی ہوں"۔

کامنی کی چیخ نکل گئی۔ کالی چرن کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

کلیانی پھر کہنے لگی "مرنے کے علاوہ تم نے کہا۔ ایکیا قصور کیا ہے۔ میرے لئے اگر دونوں جہانوں میں جگہ نہیں ہے۔ تو بتاؤ میں کہاں جاؤں؟"

وہ پھر چلا کر بولی "کہاں جاؤں" یہ کہتے ہی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔

(۴)

کلیانی کسی نہ کسی طرح اپنے سسرال کانپور پہنچی۔ اُس وقت اس کی جیٹھانی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔ نوکرانی باورچی خانہ میں تھی۔ بیمار بچہ بخار اتر جانے پر سویا پڑا تھا۔ کلیانی نظر بچا کر بچہ کے پاس پہنچی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کر سسرال آئی تھی وہ خود بھی اس بات کو نہ جانتی تھی۔ شاید آخری مرتبہ اپنے ہاتھوں سے پرورش پائے ہوئے بچے کو دیکھنے کے لئے ہی آگئی ہو۔

چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ بیمار بچہ پڑا سو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں محبت سے اُمڈ پڑیں۔ اُسے اُٹھا کر وہ محبت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ سوچتی تھی کہ میں نہیں ہوں۔ اس بچے کو دیکھنے والا۔

اس کی خیر خبر لینے والا اور کون ہے۔ اس کی ماں کو اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔ میں نے ہی اس کی پرورش کر کے اُسے اتنا بڑا کیا ہے۔ اب کون اس کی پرورش کرے گا۔ اچانک ہی بچے نے کروٹ بدلی۔ کمزور آواز سے بولا "چاچی! پانی دو۔ کلیانی اپنے دل میں کہنے لگی۔ میرا بچہ ابھی تک مجھے نہیں بھولا"۔ اس نے جلدی سے اُسے پانی پلایا۔

جب تک تو بچہ نیند میں تھا۔ تب تک تو وہ پہلے کی طرح چاچی کے ہاتھ سے پانی پیتا رہا۔ مگر جب کلیانی نے اُسے پھر لٹا دیا۔ تب ان کی نیند کھل گئی۔ وہ چاچی سے لپٹ کر بولا۔ "چاچی! تم مر گئی تھی؟"

چاچی نے کہا "ہاں بچہ"۔

بچے نے بھولے پن سے کہا "اب تو پھر آگئی ہے۔ اب تو تم نہیں مروگی؟"

اس کا جواب دینے سے پہلے ہی بہت شور وغل مچ گیا۔ نوکرانی بچہ کے لئے ساگودانہ لے کر آئی۔ یک لخت کلیانی کو دیکھ کر ساگودانہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی نوکرانی کی چلاہٹ سن کر جٹھانی بھی تاش پھینک کر آئی۔ اور یہاں کا نظارہ دیکھ کر

دنگ رہ گئی۔ اس کا جسم کانپ اٹھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ یہ سب معاملہ دیکھ کر بچّہ بھی ڈر گیا۔ اس نے رو کر کہا "چاچی تم جاؤ۔"

کلیانی نے آج کئی دنوں بعد محسوس کیا۔ کہ وہ مری نہیں ہے۔ وہی پرانا گھر۔ وہی آدمی۔ وہی بچّہ اور وہی بچّہ کی محبّت ہے۔ اس میں اور ان سب چیزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کامنی کے ہاں اُسے یہی خیال تھا۔ کہ وہ مر گئی ہے۔ مگر بچے کے گھر آکر اس نے دیکھا اور سمجھا کہ وہ مری نہیں۔ زندہ ہے۔ اس نے اپنی جیٹھانی سے کہا "بہن! مجھے دیکھ کر تم کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تو زندہ ہوں"۔ رام گوپال کی عورت کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

اتنے میں رام گوپال اندر آئے۔ کلیانی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولے "بہو! کیا تم کو یہی لازم ہے۔ یہی ایک بچہ ہمارے خاندان میں ہے۔ اس پر تمہاری نگاہ کیوں ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد سے ہی تمہاری یاد میں دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی بیماری نہیں جاتی۔ وہ دن رات چاچی۔ چاچی کرتا رہتا ہے۔ جب تم اس دُنیا سے چلی گئی ہو۔ تو تمہارے لئے یہ محبّت اچھی نہیں۔ ہم

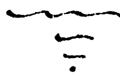
تمہارا انشرادھ گیا میں کرا دیں گے"۔

یہ سن کر کلیانی بے صبری ہو گئی۔ اس نے کڑک کر کہا۔ میں مری نہیں ہوں۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ کہ میں مری نہیں ہوں۔ یہ دیکھ۔ اتنا کہہ کر اس نے لوٹا اٹھا کر سر میں مارا۔ سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

پھر اس نے کہا۔ دیکھو میں جیتی جاگتی ہوں۔ رام گوپال بت کی طرح کھڑے رہے۔ بچہ ڈر سے دادا۔ دادا پکارنے لگا۔ دونوں بیہوش عورتیں زمین پر پڑی تھیں۔

ہوش آنے پر کلیانی "میں مری نہیں۔ میں مری نہیں" کہہ کر باہر نکل گئی۔ اور باہر صحن کے کنوئیں میں کود پڑی۔ رام گوپال نے اندر سے ہی اس کے کودنے کی آواز سنی۔

رات بھر پانی برستا رہا۔ اس کے دوسرے دن بھی پانی برسنا بند نہ ہوا۔ اس طرح مری ہوئی کلیانی نے پھر مر کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ مری نہ تھی۔ رام گوپال کے دل میں ہمیشہ کیلئے شعلۂ الم روشن کر گئی۔



شعلۂ آب

افسانہ نمبر ۱۵

خواہش

میرے نغموں نے اپنی زیبائش دور پھینکدی ہے ۔ اُنہیں آرائش کا غرور نہیں رہا

زیور ہمارا ملاپ نہیں ہونے دیتے ۔ وہ تیرے اور میرے درمیان حائل ہیں ۔ اُن کی جھنکاریں مری آرزو پوشیدہ تر ہو جاتی ہے ۔

میری پر غرور شاعری تیرے مقابل جھوٹے غرور سے شرمندہ ہو کر زائل ہو جاتی ہے ! اے اُستادالشعرا ! میں تیرے قدموں میں آبیٹھا ہوں، مجھے اپنی زندگی کو سیدھا اور سادا تھا بنانے دے تاکہ میں بانسری کیطرح رف تیرے ہی لئے اسے موسیقی سے معمور کردوں ۔

شعلہ آب

لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رکھا گیا "سوبھاشینی" یعنی شیریں زبان والی۔ مگر قدرت ایک الجھی گتھی ہے جسے آج تک کوئی بھی سلجھا نہیں سکا۔ اس بات کا کسے علم تھا۔ کہ لڑکی بڑی ہو کر گونگی ہو گی۔ اس کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ ایک سکیشنی دوسری سوہاشینی۔ اور اسی مقابلہ سے اُس کا نام رکھا گیا تھا۔ سوبھاشینی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہو گیا ہے۔ جب لمبا نام ہو۔ تو کہنے والے مختصر ہی کہتے ہیں۔ اختصار کے طور پر سوبھاشینی بھی سوبھا کے نام سے مشہور ہونے لگی۔

پہلی دو لڑکیوں کی شادی خواہش کے مطابق ہو چکی تھی۔ مگر اب یہ چھوٹی لڑکی والدین پر ایک خاموش مگر وزنی بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ عام خیال تھا۔ کہ جیسے یہ قوت گویائی سے محروم ہے۔ ویسے ہی اس کا خانہ عقل بھی خالی ہو گا۔ اور وہ اپنی شادی کی ضرورت کو بالکل محسوس نہیں کر سکتی۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ سوبھا بلا کی ذہین تھی۔ اور یہ خاص طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ قدرت نے جسے ایک نعمت سے محروم کیا ہو۔ اس کی دماغی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے سوبھا بچپن سے ہی خود کو والدین پر ایک بوجھ خیال کرتی تھی۔ مگر اُسے اس کی تلافی کے لئے کوئی بھی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں اُس کی یہ کوشش ہر وقت تھی۔ کہ عوام سے دور رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ دنیا کو بھول جانا چاہتی مگر ایسے کرنا اس کے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا۔

اس کے والدین اس تکلیف کو بھول جانے کی کوشش کرتے مگر نہیں۔ دلی درد کو کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس کی وجہ سے وہ شب و روز نہایت فکرمند رہتے۔ خاص طور پر اُس کی ماں تو اُسے بڑی ہی بے چین اور مایوس نظروں

سے دیکھتی۔ مگر ایک آہ سرد کھینچ کر رہ جاتی۔ قدرت کے آگے کسی کا روز نہیں۔

ماں کو لڑکے کی بہ نسبت لڑکی سے زیادہ اُنس ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کہ میں نے اسے ایک قابل عورت بنانا ہے اگر اس میں کسی قسم کی کمی ہو تو وہ اُسے اپنی توہین تصوّر کرتی ہے۔ اور خود بخود ذلت و شرم محسوس کرتی ہے۔ سوبھا کا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ماں اُسے خود پر ایک دھبہ خیال کرتی ہے۔ دل ہی دل ایشور کو خود کو قسمت کو اور کبھی کبھی سوبھا کو بھی گالیاں دینے لگتی تھی۔

سوبھا کو قدرت نے زبان تو عطا نہ کی تھی۔ مگر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تو موجود تھیں۔ جب کبھی کوئی خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوتا۔ اس کے ہونٹ کانپ اُٹھتے۔ آنکھیں اظہارِ خیال پر آمادہ ہو جاتیں۔

جب ہمیں کبھی اپنا خیال ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ تو ابتدائی الفاظ کی بندش کے لئے کافی دماغ سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ کو تجویز کرنا بالکل آسان کام نہیں۔

اپنے خیال کی ترجمانی کے لئے یہ ممکن ہے۔ کہ ہم کبھی

غلطی کر دیں ۔ مگر قدرت نے آنکھیں ایک ایسی شے بنائی ہیں ۔ جن کو ترجمانی کے لئے کسی قسم کی الفاظ کی چنداں ضرورت نہیں ۔ ہمارا اپنا ہی دماغ اُن پر ایک قسم کا سایہ ڈال دیتا ہے ۔ اور آنکھیں خود بخود اظہارِ مدعا کر دیتی ہیں ۔ پھر کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہتی ۔ اصل تخیُّل پتلیوں سے اس طرح چمک اُٹھتا ہے ۔ جس طرح سیاہ بادلوں میں بجلی یا طلوع ہوتا ہوُا آفتاب ۔ ہم اپنی خوشی کو غمی کو شرارت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں ۔ مگر آنکھیں انہیں ظاہر کئے بنا نہیں رہتیں ۔

جن کو قدرت نے قوت گویائی عطا نہیں کی ۔ وہ اپنی آنکھوں سے ہی زبان کا کام لیتے ہیں ۔ جن کا اظہار گہرے سمندر کی طرح انتھا ہے ۔ مگر نمایاں آسمان کی طرح یعنی گونگے ایک بے بہا دولت سے تو محروم ہوتے ہیں ۔ مگر ایک عجیب اور پُر اسرار سکوت کے مالک سوبھا چاند پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی ۔ جو لب دریا واقع تھا ۔ جیسے گاؤں چھوٹا سا تھا ۔ ویسے ہی دریا بھی چھوٹا تھا ۔ اس میں کبھی طغیانی نہیں آتی ۔ اور نہ ہی کبھی کسی دوسری قسم کی تکلیف ہی گاؤں

والوں کو ہوئی۔ سب اُسے اپنا محسن خیال کرتے تھے۔ اور وہ بھی گاؤں کے ہر فرد کے خاندان کا وفادار رکن معلوم ہوتا تھا۔

دریا کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے درختوں کا سایہ تھا۔ گویا قدرت کا تمام حسن سمٹ کر یہاں آ گیا ہو۔ آب رواں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے فعل کے انجام میں مشغول رہتا۔

گوپال کرشن کا مکان آبادی سے کچھ نکلا ہوا دریا کی طرف تھا۔ کشتی میں آنے والے یا آر پار جانے والے اشخاص تمام آبادی کا نظارہ اچھی طرح لے سکتے تھے۔ اور خاص طور پر گوپال کرشن کا مکان تو اُن کی نظروں میں رہتا۔

سوبھا اپنے اس مختصر سے مکان سے نکل کر ہر روز دریا کے کنارے سبز گھاس پر آ بیٹھتی۔ شاید اُسے قدرت کی اس خاموش زبان سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ یا اور کچھ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس دنیوی دولت کے حلقہ میں اس بے زبان لڑکی کا کسی کو خیال بھی تھا۔ یا نہیں؟ اس کے لئے تو قدرت خاموش تھی۔ دنیا

والے خاموش تھے۔

وہ اپنا کام ختم کر کے چپ چاپ دریا کے کنارے آ بیٹھتی۔ اور قدرت کے خاموش عناصر سے ہمکلام رہتی۔

یہاں دریا کی روانی کا مدھا شور۔ گاؤں والوں کی آوازیں۔ پرندوں کی گلکاریاں۔ پتوں کی سرسراہٹ۔ یہ تمام آوازیں ایک دوسری سے ٹکرا کر اس کے لئے باعث اضطراب ہو جاتیں تمام آوازیں یک جا ہو کر ایک لہر کی صورت میں اس کے آئینہ دل کو چوٹ لگاتیں۔

قدرت کی نیرنگیاں گویا اُس کی گویائی تھیں۔ سیاہ اور منور آنکھیں اس کی زبان جو بے مطلب آوازیں اس کے کانوں تک پہنچتیں۔ اس کے نزدیک دنیا والوں کی یہی زبان تھی۔ اس مقام پر سوچا کے لئے درختوں کے تنوں سے لے کر خاموش ستاروں تک خون کے آنسو رونے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے کا سامان تھا۔

دوپہر کے وقت جب ماہی گیر کھانا کھانے چلے جاتے۔ گاؤں والے کوئی سرد جگہ تلاش کر کے بغرض آرام بیٹھتے۔ چڑیاں درختوں پر خاموش ہو جاتیں۔ گھاٹ پر سکوت کی حکومت ہوتی۔ یعنی

ہر چیز تنہائی محسوس کرتی۔ اس وقت نیلگوں آسمان کے نیچے قدرت اپنی گونگی زبان سے موجود ہوتی۔ اور یا یہ بے زبان لڑکی۔

سوبھا کے گھر دو گائیں تھیں۔ سرب باشی۔ اور پنگولی۔ ان دونوں نے صرف سوبھا کے منہ سے کبھی اپنا نام نہیں سنا۔ پھر بھی وہ اس کے پاؤں کی آواز سے ہی اندازہ لگا لیتیں کہ سوبھا آ رہی ہے۔ گو وہ بھی سوبھا کی طرح بے زبان تھیں۔ مگر اس کی بے معنی اور خاموش گفتگو کو خوب سمجھتی تھیں۔ سوبھا اُن کے قریب آتی۔ اور سرب باشی کی گردن میں اپنے بازو حائل کر دیتی۔ اپنے رخساروں کو اس کے رخساروں سے ملتی۔ اسی دوران میں پنگولی اسے اپنی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ اور اُس کے چہرے کو اپنے زبان سے چاٹتی۔ سوبھا ہر روز تین بار ضرور اور زیادہ سے زیادہ جتنی بار ہو سکتا۔ ان کے پاس آتی اور جب کبھی کوئی اُسے سخت سست کہتا۔ تو اُسی دم اپنی گونگی سہیلیوں کے پاس چلی آتی۔ تاکہ غم غلط ہو سکے۔ انہیں اوقات میں پنگولی اور سرب باشی اس کے دلی درد کو خود پر محسوس کرتیں اُس کے نزدیک تر ہو کر اپنے سینگ اس کے نرم بازوؤں

سے رگڑتیں ۔ اپنی بے چینی اور خاموش زبان سے اس کا غم غلط کرنے کی سعی کرتیں ۔ ان دو سہیلیوں کے علاوہ اس کے گھر چند بکریاں اور ایک بلی کا بچہ بھی تھا ۔ لیکن سوبھا کو اُن سے کچھ زیادہ انس تھا ۔ مگر وہ اُسے بہت محبت سے دیکھتے تھے جب کبھی بلی کا بچہ موقعہ پاتا اس کی گود میں آجاتا ۔ اور سوبھا اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگی کرتی تو وہ بیٹھی نیند سو جاتا ۔

اشرف المخلوقات میں بھی اُس کا ایک ساتھی تھا ۔ مگر اس بات کا اندازہ لگانا کہ اس کے تعلقات اس سے کیسے تھے ذرا مشکل ہے ۔

وہ بول سکتا تھا ۔ اُس کا نام تھا "کُدن" وہ گوسائیں کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا ۔ اور آوارہ تھا ۔ اس کے اس فعل سے والدین سخت نالاں تھے ۔ یہ بات عام مشہور ہے ۔ کہ بیکار انسان اپنوں کو ناخوش کرکے دوسروں سے خراج تحسین لیا کرتے ہیں ۔ اِس لئے کہ ان کے پاس تو کوئی کام ہوتا نہیں دوسروں کے اشاروں پر چلنا ان کا کام ہوتا ہے ۔ بالکل یہی حالت تھی کدن کی ۔ جیسے کسی گنجان آبادی کو کسی وسیع میدان

کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تاکہ عوام کچھ آرام کا سانس لے سکیں۔ ہوا خوری کر سکیں۔ ایسے ہی ایک گاؤں کے کچھ آدمیوں کو چند بیکاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ بوقت فرصت باکار آدمیوں کا وقت غپ شپ میں اچھا گذر سکے جب بھی کسی کو ان کی ضرورت ہو۔ فوراً آموجود ہوں۔

کُدن کو مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق نے یہاں تک زور پکڑا۔ کہ اس کا بہت سا وقت دریا پر کٹنے لگا۔ وہ حسب معمول دوپہر کو دریا پر مچھلیاں پکڑنے جاتا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس کی اور سوبھا کی ملاقات ہوگئی۔ خواہ وہ بیکار تھا یا کچھ کام کرتا تھا۔ مگر اُسے دوست کی پہچان تھی۔ اور دوستی کی قدر تھی۔ جب وہ ساحل پر مچھلیاں پکڑتا۔ تو اس کا ایک خاموش دوست بہترین ساتھی ہوتا۔ کُدن سوبھا کی خاموشی کی وجہ سے اُسے خاص توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اِسی اُنس کی وجہ سے وہ اُس کا پورا نام لینے کی بجائے صرف سوؔ ہی کہہ کر پکارتا تھا۔

سوبھا آملہ کے پیڑ کے نیچے آرام سے سر ہتھیلی پر رکھے بیٹھی رہتی۔ اور کدن چند قدم کے فاصلہ پر اپنی ڈور کو دریا میں ڈالے

رہتا۔ وہ ہر روز اپنے ساتھ چند خالی پان لے آتا جنہیں سوبھا آرام سے بیٹھی بیٹھی بناتی اور گاہے گاہے اسے دیتی۔

کافی دیر تک بیٹھے اور مچھلی کا شکار دیکھتے رہنے کے دوران میں شوبھا کی خواہش ہوتی۔ کہ وہ اپنے تئیں کدن پر ایک بڑی مددگار ثابت کرے۔ اور کسی طرح سمجھاوے۔ کہ وہ اِس عالم پر بے کار بوجھ نہیں ہے۔ مگر اس کے پاس اس اظہار کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کے لئے بھگوان سے پراتھنا کرتی۔ تاکہ وہ اپنی کرامات سے کدن کو متحیر کر سکے۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ سن سکے۔

"میرے خواب میں بھی نہ تھا۔ کہ میری سُو ایسا کر سکے گی۔"
خیال تو کیجئے اگر سوبھا کوئی پری ہوتی۔ تو وہ دریا سے آہستگی کے ساتھ اٹھتی۔ اور بجائے ایک جھفر جھیز مچھلی کے کدن کے لئے ایک سانپ کا من کنارے پر لا ڈالتی۔ اور کدن اسی وقت اپنا شکار چھوڑ کر دریا میں چھلانگ لگاتا پھر کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچتا۔ اور دیکھتا کہ گونگی لڑکی سُو چاندی کے محل میں زریں بستر پر آرام فرما ہے۔ اس وقت سوبھا جواہرات سے منور ہونے والے شہر کے بادشاہ کی بیٹی معلوم ہوتی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ

ناممکن تھا بالکل ناممکن۔ در اصل ناممکن تو کوئی بات نہیں۔ مگر مشکل تو یہ بات تھی۔ کہ وہ پانالپور کے شاہی خاندان میں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک براہمن کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ گوسائیں کے لڑکے کو حیران کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پاتی۔

دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گذرتے گئے وہ جوان ہوگئی اور خود کو سمجھنے لگی۔ اس دوران میں ایک ناقابل اظہار تخیل سمندر کے وسطی مقامات سے اٹھنے والی موجوں کی طرح جب کہ چاند مکمل ہوتا ہے۔ اس کے دماغ سے پیدا ہوا اور وہ اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھتی۔ پھر سوال کرتی۔ مگر جواب نہ ملتا۔ جس سے اُسے کچھ تسلی ہو۔

شب منور تھی۔ چاند اپنے پورے جوبن میں آسمان پر جلوہ افگن تھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایسی خوبصورت رات پہلے نہیں دیکھی۔ سوبھا نے اپنے مکان کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اور ڈرتے ڈرتے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس وقت قدرت بھی سوبھا کی طرح تنہا خوابیدہ زمین کو دیکھ رہی تھی۔ سوبھا کی مضبوط اور جوان زندگی یہ عالم دیکھ کر بےتاب ہو گئی اور

رنج و راحت سے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ یوں تو وہ تنہا ہی تھی۔ مگر اس عالم تنہائی نے اُس تکے کے خیال کو اور بھی سخت بنا دیا۔ اس کا دل وزنی ہوگیا۔ اس کی زبان نہ چلتی تھی اسلئے ایک لفظ بھی نہ نکال سکی۔ گویا خاموش دھرتی ماتا کے ایک کنارے ایک خاموش حیران اور پریشان لڑکی کھڑی تھی۔

والدین سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں جو اُن سے پوشیدہ ہو۔ سوبھا کی شادی کے خیال نے اس کے والدین کو بڑی فکر میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ لوگ اکثر اُنہیں بُرا بھلا کہتے اور اپنی برادری سے خارج کردینے کی دھمکی بھی دیتے۔ عام خیال تھا۔ کہ لڑکی آوارہ ہو رہی ہے۔ اس کے گھر خوشحالی تھی۔ روزانہ دونوں وقت چاول اور مچھلی پکتی۔ اس لئے حاسد بھی کم نہ تھے۔ عورتوں کے کہنے سننے سے اس کا باپ کچھ دن کیلئے گاؤں سے چلا گیا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد واپس آکر کہنے لگا "ہمیں کلکتہ چلنا چاہیئے" سب اس اجنبی مقام پر جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ یہ دیکھ کر سوبھا کا دل بیٹھ گیا۔ آنکھیں کہر آلود صبح کی طرح تر ہوگئیں۔ اور ایک نامعلوم خوف کی وجہ سے جو اس کے دل میں جم چکا تھا۔۔۔ ایک بے زبان جانور کی طرح وہ اپنے والدین کے پیچھے پڑ گئی۔ اپنی لمبی اور بڑی بڑی آنکھوں سے اُن کا منہ تکتی اور ان کے دلی خیال معلوم کرنا چاہتی۔ مگر سب

خاموش تھے بالکل خاموش۔

ان تمام باتوں کے دوران میں ایک سہپہر کو کدن شکار کرتے کرتے سوبھا کے پاس آبیٹھا۔ اور ہنس کر کہنے لگا۔

سو تمہارے باپ نے تمہارے لئے اچھا شوہر چنا ہے۔ اب تمہاری شادی بہت جلد ہونے والی ہے۔ کیسی خوشی کی بات ہے؟ کیا تم مجھے بالکل بھول جاؤ گی؟ ایسا نہ کرنا۔۔ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کدن کے لئے شاید یہ الفاظ بالکل معمولی تھے مگر بیچاری سوبھا کیلئے ایسا نہ تھا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح اپنے شکاری کا منہ تکنے لگی۔ اور اپنی خاموش زبان سے دریافت کرنے لگی۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا۔ معاف کرو"۔۔۔۔۔۔ وہ اشک بار آنکھوں سے کدن کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکی۔ اور چلی گئی۔

اس کا باپ اپنی خواب گاہ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب سوبھا نے اُسے دیکھا۔ اور روتے ہوئے اپنے آپ کو اُس کے پاؤں پر ڈال دیا۔ باپ کی آنکھیں بھی پرنم ہوگئیں۔ اس نے اُسے چھاتی سے لگالیا۔ اور بہت پیار کیا۔۔۔ مگر سوبھا کی آنکھوں سے ایک چشمہ ابل پڑا تھا۔ آخر یہ فیصلہ طے ہوا۔ کہ وہ آئندہ صبح کو کلکتہ روانہ ہو جائیں۔ سوبھا نے گایوں کے قریب آکر اپنی سہیلیوں کو الوداع و خیر آباد کہی۔ اپنے ہاتھوں سے

کھلایا۔ گلے سے لگایا۔ ان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پھر اُداس ہوگئی۔ اس کی وہ آنکھیں جو زبان کا کام دیتی تھیں۔ اشک بار ہوگئیں۔ اور پھر جیسے کسی برساتی نالے کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ جس شب کا یہ واقعہ ہے۔ وہ رات چاندنی۔ سوبھا کمرے سے نکل کر اسی دل پسند گھاس کے سبز بستر پر لب دریا آلیٹی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر اس طرح پھیلا دئے۔ گویا وہ اپنی پُرسکوت ماں سے کہہ رہی ہے۔ "مجھے اپنے سے جدا نہ کرنا۔ مجھے اپنی آغوش محبت میں لے لو۔ اور چھاتی سے لگا لو۔" مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ دوسرے دن سب روانہ ہوگئے

ایک دن کلکتہ کے کسی مکان میں سوبھا کی ماں نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ سر گوندھا۔ زیوروں سے آراستہ کیا۔ یہ سب سامان دیکھ کر سوبھا کی آنکھیں اسی سابقہ روانی سے بہنے لگیں۔ اس اچھے وقت میں اور ساتھ ہی اس ڈر سے کہ اس کی آنکھیں خراب نہ ہوجائیں اس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ مگر آنسوؤں کی تیزی زیادہ ہوگئی اسی وقت دولہا اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لئے اندر آیا۔ اس وقت والدین کے دل دھک دھک کر رہے تھے مبادا لڑکا لڑکی کو پسند نہ کرے۔ پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔

اس امتحان کے داخلے سے پیشتر سوبھا کی ماں نے لڑکی کو خاموش

رہنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ تھا۔

معائنہ کرنے والوں نے اُسے دیر تک اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا۔" اچھی ہے "

اس کے رونے پر خاص توجہ کی گئی۔ اور خیال کیا کہ یہ اس کے نرم دل ہونے کی اول دلیل ہے۔ اور اپنے دل میں اس موضوع پر بحث کی۔ کہ وہ دل جو آج اپنے والدین سے جدا ہونے پر اس قدر ملول ہے۔ کل یقیناً اچھا ثابت ہوگا۔ آنسوؤں نے جو در اصل شعلہ غم سے پگل پگل کر خون نکل رہا تھا۔ سوبھا کی قدر و منزلت بڑھاوی اور دولہا نے سوبھا میں کوئی نقص نہ پایا۔ آخر کار ایک مبارک دن شادی کے لئے تجویز ہُوا۔ اور اپنی گونگی لڑکی کا ہاتھ ایک دوسرے کے حوالے کر کے سوبھا کے والدین اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ انہوں نے شکر کیا۔ کہ وہ دین و دنیا کی برائی سے بچ گئے۔ بھگوان نے لاج رکھ لی۔

سوبھا کے شوہر کا روزگار کسی دوسرے شہر میں تھا۔ شادی کے چند دن بعد وہ اُسے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ صرف ایک ہفتہ کے عرصہ میں ہی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ دلہن بے زبان ہے۔ اگر اس سے پیشتر ان کو معلوم نہ ہو سکا۔ تو اِس میں اُس

بیچاری گونگی کا کیا قصور۔ اس نے تو کسی کو بھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کبھی زندگی میں اُس نے اس راز کو کسی سے چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں اظہار مدعا کر رہی تھیں۔ مگر کسی نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اُس نے ہر ایک کو بار بار دیکھا۔ التجا کی۔ مگر سمجھنے والے نہ سمجھ سکے۔ کہ ایک غریب گونگی کیا کہہ رہی ہے؟

افسوس بچپن سے جو اس کی خاموش زبان سمجھتے تھے وہ تو بچھڑ گئے۔ اب وہ اپنا غم غلط کرے تو کس طرح؟ اب شب و روز اس کے خاموش دل سے بے آواز مگر کبھی نہ رُکنے والی آواز آیا کرتی۔ جس کو تمام دماغ سمجھنے سے قاصر تھے۔ صرف سب کے دلوں کا حال جاننے والا ہی سمجھ سکتا تھا ؎

سوزِ غم میں دیدۂ تر کام آسکتا نہیں
یہ وہ آتش ہے جسے پانی بجھا سکتا نہیں

ختم شد

پسند اوراق "قلم برداشتہ" ایم اسلم ضیغم معجز نگار امرتسری

طوفان

شری ٹیگور کا بے مثال تحفہ

دنیا ادب کے باکمال شاعر ٹیگور کا نام کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا شاہکار ان کا ماسٹر پیس ہے، دلچسپ، سنسنی خیز، عبرت ناک، سبق آموز، حیرت انگیز اور پُراثر واقعات کا مرقع، انسانی زندگی کے نشیب فراز، حسن وجمال کی پاکیزہ، دلاویز داستان، دنیا کی سرد مہری، عشق اور فرض کا تصادم۔ اس کا ہر باب آپ کے دل پر اثر چھوڑے گا۔ نہایت پُردرد اور ہر باب میں ایک نئے راز کا اضافہ، آپ ایک بار شروع کر لیں۔ پھر چھوڑنے کو دل نہ چاہے گا۔

قیمت مجلد عہ